دعوت اسلامی

اصول اور تقاضے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
اور
مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تعارف

جماعت اسلامی نے اسلام کے متعلق جو لٹریچر تیار کیا ہے اس کی افادیت اور ہمہ گیری کا ہر شخص معترف ہے۔ کسی شخص کو اس دعوت سے اختلاف ہو یا اتفاق مگر یہ بات ہر شخص مانتا ہے کہ دین حق کا مفہوم وہی ہے جو اس لٹریچر میں پیش کیا گیا ہے اور اسلام کے اصلی تقاضے اور مطالبے وہی ہیں جو اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ اسلام اور غیر اسلام کو ایک دوسرے سے ممیّز کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ باطل کے اس غلبے اور تسلط کے دور میں یقیناً آپ اپنی نظیر ہے۔

جماعت اسلامی کا لٹریچر کافی وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔ اور اب وقت کی یہ اہم ترین ضرورت ہے کہ اس سب کا ایک ایسا جامع خلاصہ پیش کیا جائے جس کو پڑھ کر کوئی شخص جماعت اسلامی کی دعوت کے بارے میں ایک واضح تصور قائم کر سکے۔ یہ ضرورت تو بہر حال جب بھی پوری ہو لیکن زیر نظر مجموعے کی اشاعت سے توقع ہے کہ یہ ضرورت کسی نہ کسی حد تک ضرور پوری ہو جائے گی۔

سب سے پہلے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی دو تقریریں ہیں جن میں پہلی تقریر پڑھ کر نہ صرف مسلم حضرات بل کہ غیر مسلم اصحاب کو بھی تحریک اسلامی کے مزاج اور اصولوں سے بڑی حد تک واقفیت ہو جائے گی۔ اور دوسری تقریر سے نہایت جامعیت کے ساتھ دعوت اسلامی کا

تعارف ہو سکے گا۔ تیسری تقریر مولانا امین احسن صاحب کی ہے جو اسی مقصد کے لیے بالخصوص مسلم حلقوں میں بہت کارآمد ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس مجموعے کو قبول فرمائے اور جس پیغام کو پہنچانے کے لیے اس کو شائع کیا جا رہا ہے وہ زائد سے زائد انسانوں تک اس کے ذریعے پہنچے اور ان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی قبولیت کے لیے کشادہ کر دے۔

ناشر

ترتیب

تعارف	۳
جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے اصول	۷
دعوت اسلامی اور اس کا طریق کار	۲۵
اجتماعات کا مقصد	۲۶
ہماری دعوت کیا ہے؟	۲۷
دعوتِ اسلامی کے تین نکات	۲۷
بندگی رب کا حقیقی مفہوم	۲۸
منافقت کی حقیقت	۲۹
تناقض کی حقیقت	۳۱
امامت میں تغیر کی ضرورت	۳۳
امامت میں انقلاب کیسے ہوتا ہے؟	۳۴
مخالفت اور اس کے اسباب	۳۴
ہمارا طریق کار	۳۹
علماء اور مشائخ کی آڑ	۴۶
زہد کا طعنہ	۴۷
رفقائے جماعت سے خطاب	۵۰

دعوت اسلامی اور اس کی کامیابی کے اصول	۵۷
اسلام کے اساسی معتقدات اور ان کا مفہوم	۵۹
ایمان باللہ	۵۹
ایمان بالرسالت	۶۰
ایمان بالکتاب	۶۲
حق و باطل کے معرکے میں ہمارا فرض	۶۴
مسلمانوں کے اقسام	۶۵
جماعت اسلامی اور اس کے قیام کی غرض وغایت	۶۶
کامیابی کا معیار	۶۸
نصرت حق کب آتی ہے؟	۶۹

جماعت اسلامی کی دعوت
اور
اس کے اصول

ہماری یہ جماعت جس غرض کے لیے اٹھی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں، اور آغاز کار کے طور پر اس ملک میں، ایک ایسی سوسائٹی منظم کی جائے جو اسلام کے اصلی اصولوں پر شعور و اخلاص کے ساتھ خود عامل ہو، دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اس کی صحیح نمایندگی کرے، اور بالآخر جہاں جہاں بھی اس کی طاقت بڑھتی جائے وہاں کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست اور معیشت کے نظام کو موجودہ دہریت و مادہ پرستی کی بنیادوں سے ہٹا کر سچی خدا پرستی، یعنی توحید کی بنیاد پر قائم کردے۔ اس جماعت کو یہ یقین ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کا پورا نظام زندگی جن اصولوں پر قائم ہے وہ قطعاً فاسد اصول ہیں اور اگر دنیا کا انتظام ان ہی اصولوں پر چلتا رہا تو بڑے ہولناک نتائج سے دوچار ہوگی ـــــ اس کے جو نتائج اب تک نکل چکے ہیں، وہ بھی کچھ کم ہولناک نہیں ہیں، مگر انھیں کوئی نسبت اس انجام کی ہولناکی سے نہیں ہے جس کی طرف یہ تہذیب دنیا کو لیے جارہی ہے ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ ہم اس دنیا سے کہیں باہر نہیں جی رہے ہیں بل کہ اس کے اندر ہی سانس لے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ان اصولوں کو فاسد اور بدانجام سمجھتے ہوئے بھی منفعلانہ طریقے سے اسی نظام کے تحت زندگی بسر کیے جائیں اور تہذیب حاضر کے مغربی اماموں اور مشرقی مقلدوں کی پیشوائی و سربراہ کاری کے آگے سپر ڈالے رہیں، تو جس تباہی کے گڑھے میں یہ دنیا گرے گی اسی میں اس کے ساتھ ہم بھی جاگریں گے اور ہم اس انجام کے مستحق ہوں گے۔

ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں، اور اپنے اس علم پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے انسان کی رہنمائی کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت نازل کی ہے اسی کی پیروی میں ہماری اور سب انسانوں کی فلاح مضمر ہے، اور انسانی زندگی کا پورا نظام اسی وقت صحیح چل سکتا ہے جب کہ اسے ان پر قائم کیا جائے جو انسان کو خالق کی دی ہوئی اس ہدایت میں ہم کو ملتے ہیں۔ ہمارے اس علم و یقین سے یہ فرض خود بہ خود ہم پر عائد ہو جاتا ہے اور یہی فرض خدا نے بھی اپنے مطیع فرمان بندوں پر عائد کیا ہے ـــــ کہ ہم اس نظام زندگی کے خلاف جنگ کریں، جو فاسد اصولوں پر چل رہا ہے اور وہ صالح نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں جو خدائی ہدایت کے دیے ہوئے اصولوں پر مبنی ہو۔ یہ کوشش صرف اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا کی خیر خواہی ہم سے اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ نہیں ہم خود اپنے بھی سخت بدخواہ ہوں گے اگر اسی سعی و جہد میں اپنی جان نہ لڑائیں کیوں کہ جب اجتماعی زندگی کا سارا نظام فاسد اصولوں پر چل رہا ہو، جب باطل نظریات و افکار ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں، جب خیالات کو ڈھالنے اور اخلاق و سیرت کو بنانے کی عالم گیر طاقتوں پر فاسد نظام تعلیم گم راہ کن ادبیات، فتنہ انگیز صحافت اور شیطنت سے لبریز ریڈیو اور سنیما کا تسلط ہو، جب رزق کے تمام وسائل پر ایک ایسے معاشی نظام کا قبضہ ہو جو حرام و حلال کی قیود سے ناآشنا ہے، جب تمدن کی صورت گری کرنے اس کو ایک خاص راہ پر چلانے کی ساری طاقت ایسے قوانین اور ایسی قانون ساز مشینری کے ہاتھ میں ہو جو اخلاق و تمدن کے سراسر مادہ پرستانہ تصورات پر مبنی ہیں، اور جب قوموں کی امامت اور انتظام دنیا کی پوری زمام کاران لیڈروں اور حکمرانوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا کے خوف سے خالی اور اس کی رضا سے بے نیاز ہیں اور اپنے کسی معاملے میں بھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان کے خالق کی ہدایت اس معاملے میں کیا ہے، تو ایسے نظام کی ہمہ گیر گرفت میں رہتے ہوئے ہم خود اپنے آپ کو ہی اس کے برے اثرات اور بدتر نتائج سے کب بچا سکتے ہیں۔ یہ نظام جس جہنم کی طرف جا رہا ہے اسی طرف وہ دنیا کے ساتھ ہمیں بھی گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ اگر ہم اس کی مزاحمت نہ کریں اور اس کو بدلنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور نہ لگائیں، تو یہ ہماری، اور ہماری آیندہ نسلوں کی دنیا خراب اور عاقبت خراب تر کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا محض دنیا کی اصلاح ہی کے لیے نہیں بل کہ خود اپنے بچاؤ کے لیے بھی یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے ـــــ اور یہ سب فرضوں سے بڑا فرض ہے ـــــ کہ ہم جس نظام زندگی کو پوری بصیرت کے ساتھ

فاسد و مہلک جانتے ہیں اسے بدلنے کی سعی کریں اور جس نظام کے برحق اور واحد ذریعۂ فلاح و نجات ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اسے عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔

اس مختصر گزارش سے آپ یہ بات پا گئے ہوں گے کہ ہمارا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بل کہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے اور ان ہی اصولوں پر چلتا رہے مگر اس کو مغربی نہ چلائے مشرقی چلائے۔ یا انگریز نہ چلائے ہندستانی چلائے یا ہندو نہ چلائے مسلمان چلائے۔ ہمارے نزدیک ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سور تو بہ ہر حال سور ہی ہے اور اپنی ذات میں ناپاک ہے، خواہ اسے غیر مسلم باورچی پکائے یا مسلمان باورچی پکائے بل کہ مسلمان باورچی کا سور پکانا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے اور گم راہ کن بھی۔

بہت سے بندگان خدا حتی کہ اچھے خاصے پرہیز گار لوگ بھی اس ظالم کے ہاتھ کا پکا ہوا سور اس اطمینان پر کھا جائیں گے کہ یہ مسلمان نے پکایا ہے۔ اور اگر اس پخت و پز کے دوران میں چمچے کی ہر گردش پر وہ بآواز بلند بسم اللہ پڑھ دیا کرے اور اس کے چنے ہوے دسترخوان پر مسلمانوں کو غیر مسلم کے دسترخوان کی بہ نسبت تناول ماحضر کی زیادہ آسانیاں اور آزادیاں میسر ہوں اور محفل طعام کے گرد و پیش کچھ ایسے لوازم بھی فراہم کر دیے جائیں جو عام طور پر اسلامی لوازم سمجھے جاتے ہیں تو اس قسم کی نمایشی باتیں اس حرام خوراک کو قبول کر لینے کے لیے کوئی سفارش نہ ہونی چاہئیں۔ بل کہ یہ ظاہر فریبیاں اس معاملے کو اور بھی زیادہ پرخطر بنا دیتی ہیں۔ لہٰذا ہم کسی ایسی ظاہری تبدیلی پر خود نہ مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کو مطمئن ہوتے دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ فاسد نظام تو جوں کا توں قائم رہے اور صرف اس کے چلانے والے ہاتھ بدل جائیں۔ ہماری نظر ہاتھوں پر نہیں بل کہ ان اصولوں پر ہے جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے وہ اصول اگر فاسد ہوں تو ہم ان کے خلاف جدوجہد جاری رکھیں گے اور انھیں صالح اصولوں سے بدلنے کی کوشش کریں گے۔

یہ تو ہے ہمارا مدعا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بھی واضح طور پر سمجھ لیں کہ موجودہ تہذیب کے وہ اصول کیا ہیں جن کو ہم مٹانا چاہتے ہیں اور ان کے جواب میں دوسرے اصول کون سے ہیں جن کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ تہذیب جس پر آج دنیا کا پورا فکری، اخلاقی تمدنی، سیاسی اور معاشی نظام چل رہا ہے اور دراصل تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔

۱۔ Secular یعنی لادینی یا دنیاویت۔

۲۔ Nationalism یعنی قوم پرستی۔

۳۔ Democracy یعنی حاکمیت جمہور۔

ان میں سے پہلے اصول، یعنی لادینی کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ہدایت اور اس کی عبادت کے معاملے کو ایک ایک شخص کی ذاتی حیثیت تک محدود کر دیا جائے اور انفرادی زندگی کے اس چھوٹے سے دائرے کے سوا دنیا کے سارے معاملات کو ہم خالص دنیوی نقطۂ نظر سے اپنی صواب دید کے مطابق خود جس طرح چاہیں طے کریں۔ ان معاملات میں یہ سوال خارج از بحث ہونا چاہیے کہ خدا کیا کہتا ہے اور اس کی ہدایت کیا ہے اور اس کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ ابتداءً یہ طرز عمل اہل مغرب نے عیسائی پادریوں کی اس خود ساختہ دینیات سے بیزار ہو کر اختیار کیا تھا جو ان کے لیے زنجیر پا بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی طرز عمل ایک مستقل نظریۂ حیات بن گیا اور تہذیب جدید کا پہلا سنگ بنیاد قرار پایا۔ آپ نے اکثر یہ فقرہ سنا ہوگا کہ ''مذہب ایک پرائیوٹ معاملہ ہے، خدا اور بندے کے درمیان'' یہ مختصر سا فقرہ دراصل تہذیب حاضر کا ''کلمہ'' ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ اگر کسی کا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی پرستش کرنی چاہیے تو اپنی انفرادی زندگی میں بہ خوشی اپنے خدا کو پوجے، مگر دنیا اور اس کے معاملات سے خدا اور مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ اس ''کلمہ'' کی بنیاد پر جس نظام زندگی کی عمارت اٹھی ہے، اس میں انسان اور انسان کے تعلق اور انسان اور دنیا کے تعلق کی تمام صورتیں خدا اور مذہب سے آزاد ہیں۔ معاشرت ہے تو اس سے آزاد، تعلیم ہے تو اس سے آزاد، معاشی کاروبار ہے تو اس سے آزاد، قانون ہے تو اس سے آزاد، پارلیمنٹ ہے تو اس سے آزاد، سیاست اور انتظام ملکی ہے تو اس سے آزاد، بین الاقوامی ربط وضبط ہے تو اس سے آزاد۔ زندگی کے ان بے شمار مختلف پہلوؤں میں جو کچھ بھی طے کیا جاتا ہے اس سوال کو نہ صرف ناقابل لحاظ، بل کہ اصولاً غلط اور انتہائی تاریک خیالی سمجھا جاتا ہے کہ ان امور کے متعلق خدا نے بھی کچھ اصول اور احکام ہمارے لیے مقرر کیے ہیں یا نہیں؟ رہی انفرادی زندگی تو وہ بھی لادینی تعلیم اور بے دین اجتماعیت کی بہ دولت اکثر وبیش تر

افراد کے معاملے میں نری دنیاوی ہی ہو کر رہ گئی ہے اور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کیوں کہ اب بہت ہی کم افراد کا ضمیر واقعی یہ گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی بندگی کرنی چاہیے۔ خصوصاً جو لوگ اس وقت تمدن کے اصلی کارفرما اور کارکن ہیں ان کے لیے تو مذہب اب ایک پرائیوٹ معاملہ بھی نہیں رہا ہے۔ ان کا ذاتی تعلق بھی خدا سے ٹوٹ چکا ہے۔

دوسرے اصول، یعنی قوم پرستی کی ابتداء تو پوپ اور قیصر کے عالم گیر استبداد کے خلاف رجعت کے طور پر ہوئی تھی اور اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ مختلف قومیں اپنی اپنی سیاست و مصلحت کی آپ ہی مالک و مختار ہوں، کسی عالم گیر روحانی یا سیاسی اقتدار کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح نہ کھیلیں۔ مگر اس معصوم آغاز سے چل کر جب یہ تخیل آگے بڑھا تو رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ جس جگہ سے بے دینی کی تحریک نے خدا کو بے دخل کیا تھا وہاں قومیت کو لا بٹھایا گیا۔ اب ہر قوم کے لیے بلند ترین اخلاقی قدر اس کا قومی مفاد اور اس کے قومی حوصلے ہیں۔ نیکی وہ ہے جو قوم کے لیے مفید ہو، خواہ وہ جھوٹ ہو، بے ایمانی ہو، ظلم ہو، یا اور کوئی ایسا فعل ہو جو پرانے مذہب و اخلاق میں بدترین گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اور بدی وہ ہے جس سے قوم کے مفاد کو نقصان پہنچے، خواہ وہ سچائی ہو، انصاف ہو، ادائے حق ہو، یا اور کوئی ایسی چیز ہو جسے کبھی فضائل اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا۔ افراد قوم کی خوبی اور زندگی و بیداری کا پیمانہ یہ ہے کہ قوم کا مفاد ان سے جس قربانی کا مطالبہ کرے، خواہ وہ جان و مال اور وقت کی قربانی ہو یا اخلاق و انسانیت اور شرافت نفس کی، بہ ہر حال وہ اس میں دریغ نہ کریں اور متحد و منظم ہو کر قوم کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو پورا کرنے میں لگے رہیں۔ اجتماعی کوششوں کی غایت اب یہ ہے کہ ہر قوم ایسے افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد بہم پہنچائے اور ان میں ایکا اور نظم پیدا کرے تاکہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنی قوم کا جھنڈا بلند کریں۔

تیسرے اصول، یعنی جمہور کی حاکمیت کو ابتداءً بادشاہوں اور جاگیرداروں کے اقتدار کی گرفت توڑنے کے لیے پیش کیا گیا تھا، اور اس حد تک بات درست تھی کہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقے کو لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی مسلط کر دینے اور اپنی اغراض کے لیے انھیں استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اس منفی پہلو کے ساتھ اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ ایک ایک ملک اور ایک ایک علاقے کے باشندے اپنے آپ حاکم اور اپنے آپ مالک ہیں۔

اسی مثبت پہلو پر ترقی کر کے جمہوریت نے اب جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم اپنی مرضی کی مختار کل ہے۔ اس کی مجموعی خواہش (یا عملاً اس کی اکثریت کی خواہش) کو پابند کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اخلاق ہو یا تمدن، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز کے لیے برحق اصول وہ ہیں جو قومی خواہش سے طے ہوں، اور جن اصولوں کو قوم کی رائے عام رد کر دے وہ باطل ہیں۔ قانون قوم کی مرضی پر منحصر ہے، جو قانون چاہے بنائے اور جس قانون کو چاہے توڑ دے۔ حکومت قوم کی رضا کے مطابق بننی چاہیے، قوم ہی کی رضا کا اسے پابند ہونا چاہیے، اور اس کی پوری طاقت قومی خواہش کو پورا کرنے پر صرف ہونی چاہیے۔

یہ تین اصول جن کی تشریح میں نے مختصراً آپ کے سامنے بیان کی ہے موجودہ دور کے نظام زندگی کی بنیاد ہیں، اور ان ہی اصولوں پر وہ بے دین جمہوری قومی ریاست بنتی ہے جسے آج کل اجتماعی تنظیم کی مہذب ترین معیاری صورت سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں اصول غلط ہیں۔ صرف غلط ہی نہیں، ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہی اصول ان تمام مصائب کی جڑ ہیں جن میں آج انسانیت مبتلا ہے۔ ہماری عداوت دراصل ان ہی اصولوں سے ہے اور ہم اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان اصولوں پر کیا اعتراض ہے اور کیوں اعتراض ہے؟ اس کی تفصیل کے لیے تو بڑی لمبی بحث درکار ہے، مگر میں اسے چند الفاظ میں آپ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کروں گا تا کہ آپ ہماری اس لڑائی کی اہمیت اچھی طرح سمجھ سکیں اور آپ کو اندازہ ہو کہ کیوں یہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ ان اصولوں کے خلاف جنگ کرنا ناگزیر ہے۔

سب سے پہلے اس لادینی یا دنیاویت کو لیجیے جو اس نظام زندگی کا اولین سنگ بنیاد ہے۔ یہ نظریہ کہ خدا اور مذہب کا تعلق صرف آدمی کی انفرادی زندگی سے ہے، سراسر ایک مہمل نظریہ ہے جسے عقل و خرد سے کوئی سروکار نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ خدا اور انسان کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یا تو خدا انسان کا اور اس ساری کائنات کا، جس میں انسان رہتا ہے، خالق اور مالک اور حاکم ہے، یا نہیں؟ اگر وہ خالق ہے نہ مالک اور نہ حاکم تب تو اس کے ساتھ پرائیوٹ تعلق کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ نہایت لغو بات ہے کہ ایک ایسی غیر متعلق ہستی کی خواہ مخواہ پرستش کی جائے جس کا ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر فی الواقع ہمارا اور اس تمام جہان ہست و

بود کا خالق، مالک اور حاکم ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی عمل داری محض ایک ایک شخص کی پرائیوٹ زندگی تک محدود ہو اور جہاں سے ایک اور ایک دو آدمیوں کا اجتماعی تعلق شروع ہوتا ہے وہیں سے اس کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہ حد بندی اگر خدا نے خود کی ہے تو اس کی کوئی سند ہونی چاہیے اور اگر اپنی اجتماعی زندگی میں انسان نے خدا سے بے نیاز ہو کر خود ہی خود مختاری اختیار کی ہے تو یہ اپنے خالق اور مالک اور حاکم سے اس کی کھلی بغاوت ہے اور بغاوت کے ساتھ یہ دعویٰ کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں خدا کو اور اس کے دین کو مانتے ہیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل ماری گئی ہو۔ اس سے زیادہ لغو بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ایک شخص فرداً فرداً تو خدا کا بندہ ہو، مگر یہ الگ الگ بندے جب مل کر ایک معاشرہ بنائیں تو بندہ نہ رہیں۔ اجزاء میں سے ہر ایک بندہ اور ان اجزاء کا مجموعہ غیر بندہ، یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تصور صرف ایک پاگل ہی کر سکتا ہے۔ پھر یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہمیں خدا کی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت نہ اپنی خانگی معاشرت میں ہے، اور نہ محلے اور شہر میں، نہ مدرسے اور کالج میں، نہ منڈی اور بازار میں، نہ پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہاؤس میں، نہ ہائی کورٹ اور سکریٹریٹ میں، نہ چھاؤنی اور پولیس لائن میں اور نہ میدان جنگ اور صلح کانفرنس میں، تو آخر اس کی ضرورت ہے کہاں؟ کیوں ایسے خدا کو مانا جائے اور اس کی خواہ مخواہ پوجا پاٹ کی جائے جو یا تو اتنا بے کار ہے کہ زندگی کے کسی معاملے میں ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔ معاذ اللہ یا ایسا نادان ہے کہ کسی معاملے میں بھی اس کی کوئی ہدایت ہمیں معقول اور قابل عمل نظر نہیں آتی؟

یہ تو محض اس معاملے کا عقلی پہلو ہے۔ عملی پہلو سے دیکھیے تو اس کے نتائج بڑے ہی خوف ناک ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے جس معاملے کا تعلق بھی خدا سے ٹوٹتا ہے اس کا تعلق شیطان سے جڑ جاتا ہے۔ انسان کی پرائیوٹ زندگی درحقیقت کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے اور اس کی پوری زندگی اصل میں اجتماعی زندگی ہے وہ پیدا ہی ایک ماں اور ایک باپ کے معاشرتی تعلق سے ہوتا ہے۔ دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے، ایک بستی سے، ایک قوم سے، ایک نظام تمدن اور نظام معیشت و سیاست سے واسطہ پیش آتا ہے۔ یہ بے شمار روابط جو اس کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اس سے جوڑے ہوئے ہیں، ان ہی

کی درستی پر ایک ایک انسان کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسان کو ان روابط کے لیے صحیح اور منصفانہ اور پائدار اصول و حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار بنا، پھر نہ تو کوئی مستقل اصول ہی رہتا ہے اور نہ انصاف اور راستی۔ اس لیے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد پھر خواہش اور ناقص علم و تجربے کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لیے رجوع کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینی یا دنیاویت کے اصول پر چلتا ہے اس میں خواہشات کی بنا پر روز اصول بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، بے انصافی، اور آپس کی بے اعتمادی گھس گئی ہے۔ تمام انسانی معاملات پر انفرادی طبقاتی، قومی اور نسلی خود غرضیاں مسلط ہو گئی ہیں۔ دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق ــــــ تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہا ہے جس میں ٹیڑھ نہ آ گئی ہو۔ ہر ایک قوم اور ملک نے اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں، جہاں تک بھی اس کا بس چلا ہے، پوری خود غرضی کے ساتھ اپنے مطلب کے اصول اور قاعدے اور قانون بنا لیے ہیں، اور کوئی بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ دوسرے اشخاص، گروہوں، طبقوں اور قوموں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ پرواہ کرنے والی صرف ایک ہی طاقت رہ گئی ہے اور وہ ہے جوتا۔ جہاں مقابلے میں جوتا یا جوتے کا اندیشہ ہوتا ہے صرف وہیں اپنی حد سے زیادہ پھیلے ہوے ہاتھ اور پاؤں کچھ سکڑ جاتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ جوتا کسی عالم اور منصف ہستی کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک اندھی طاقت کا نام ہے۔ اس لیے اس کے زور سے کبھی توازن قائم نہیں ہوتا۔ جس کا جوتا زبردست ہوتا ہے وہ دوسروں کو صرف اتنا ہی نہیں سکیڑتا جتنا اسے سکڑنا چاہیے۔ بل کہ وہ خود اپنی حد سے زیادہ پھیلنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ پس لادینی اور دنیاویت کا ماحصل صرف یہ ہے کہ جو بھی اس طرز عمل کو اختیار کرے گا بے لگام، غیر ذمہ دار اور بندۂ نفس ہو کر رہے گا، خواہ وہ ایک شخص ہو یا ایک گروہ یا ایک ملک اور قوم، یا مجموعۂ اقوام۔

اب دوسرے اصول کو لیجیے۔ قوم پرستی کی تشریح ابھی تھوڑی دیر پہلے میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں۔ وہ اگر آپ کے ذہن میں تازہ ہے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی لعنت ہے جو اس دور میں انسانیت پر مسلط ہوئی ہے۔ ہمارا اعتراض قومیت (Nationality) پر نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ایک فطری حقیقت ہے۔ ہم قومی خیر خواہی کے بھی مخالف نہیں ہیں

بہ شرطے کہ اس کے اندر دوسری قوموں کی بدخواہی شامل نہ ہو۔ہمیں قومی محبت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطے کہ وہ قومی تعصب اور اپنی قوم کی بے جا پاس داری اور دوسروں سے نفرت کی حد تک نہ جا پہنچے۔ ہم قوم کی آزادی کو بھی صحیح سمجھتے ہیں کیوں کہ اپنے معاملات کو خود انجام دینا اور اپنے گھر کا آپ انتظام کرنا ہر قوم کا حق ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت درست نہیں ہے۔ دراصل جو چیز قابل اعتراض، بل کہ قابل نفرت ہے وہ قوم پرستی (Nationalism) ہے اس قوم پرستی کی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ قومی خودغرضی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ایک سوسائٹی کے اندر اس شخص کا وجود ایک لعنت ہے جو اپنے نفس اور اپنی غرض کا بندہ ہو اور اپنے مفاد کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہو، اگر ایک بستی کے اندر وہ خاندان ایک لعنت ہے جس کے افراد اپنے خان دانی مفاد کے اندھے پرستار ہوں اور جائز و ناجائز تمام ذرائع سے بس اپنا بھلا کرنے پر تلے ہوئے ہوں، اگر ایک ملک کے اندر وہ طبقہ ایک لعنت ہے جو اپنی طبقاتی خودغرضی میں اندھا ہو رہا ہو، اور دوسروں کے بھلے برے کی پروا کیے بغیر صرف اپنے فائدے کے پیچھے پڑ جائے (مثلاً بلیک مارکیٹنگ کرنے والے) تو آخر انسانیت کے وسیع دائرے میں وہ خود غرض قوم ایک لعنت کیوں نہیں ہے جو اپنے قومی مفاد کو اپنا خدا بنا لے اور اس کی پرستش کا یہ اصول مقرر کر لے کہ ”حق وہ ہے جو قومی اغراض کے مطابق ہو اور باطل وہ جو ان کے مطابق نہ ہو۔“ آپ کا ضمیر گواہی دے گا کہ تمام خودغرضیوں اور نفسانیتوں کی طرح یہ قومی خودغرضی و نفسانیت بھی یقیناً ایک لعنت ہے۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج اس تہذیب جدید نے تمام قوموں کو اسی لعنت میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کی بہ دولت ساری دنیا ایسے قومی اکھاڑوں میں تبدیل ہو گئی ہے جن میں سے ہر اکھاڑے کی دوسرے اکھاڑے سے لاگ ڈانٹ ہے اور دو عالم گیر دنگل ہو چکنے کے بعد ابھی پسینہ بھی خشک نہیں ہوا ہے کہ تیسرے دنگل کے لیے ڈنٹر خم تازہ کیے جا رہے ہیں۔

تیسرا اصول پہلے دونوں اصولوں کے ساتھ مل کر اس بلا کی تکمیل کر دیتا ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، موجودہ تہذیب میں جمہوریت کے معنی ہیں جمہور کی حاکمیت۔ یعنی ایک علاقے کے لوگوں کی مجموعی خواہش کا اپنے علاقے میں مختار مطلق ہونا، اور ان کا قانون کے تابع نہ ہونا بل کہ قانون کا ان کی خواہش کے تابع ہونا، اور حکومت کی غرض صرف یہ ہونا کہ اس کا نظم اور اس کی طاقت لوگوں کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرنے کے کام آئے۔ اب غور کیجیے کہ پہلے تو

لادینی نے ان لوگوں کو خدا کے خوف اور اخلاق کے مستقل اصولوں کی گرفت سے آزاد کر کے بے لگام اور غیر ذمہ دار اور بندۂ نفس بنا دیا، پھر قوم پرستی نے ان کو شدید قسم کی قومی خودغرضی اور اندھی عصبیت اور قومی غرور کے نشے سے بدمست کر دیا، اور اب یہ جمہوریت ان ہی بے لگام بدمست بندگان نفس کی خواہشات کو قانون سازی کے مکمل اختیارات دیتی ہے، اور حکومت کا واحد مقصد یہ قرار دیتی ہے کہ اس کی طاقت ہر اس چیز کے حصول میں صرف ہو جس کی یہ اجتماعی طور پر خواہش کریں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی خودمختار صاحب حاکمیت قوم کا حال آخر ایک طاقت ور اور آزاد بدمعاش کے حال سے کس بات میں مختلف ہے؟ جو کچھ ایک بدمعاش فرد خودمختار اور طاقت ور ہو کر چھوٹے پیمانے پر کرے گا وہی تو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اس طرح کی ایک قوم کرے گی۔ پھر جب دنیا میں صرف ایک ہی قوم ایسی نہ ہو بل کہ ساری متمدن قومیں اسی ڈھنگ پر بے دینی، قوم پرستی اور جمہوریت کے اصولوں پر منظم ہوں تو دنیا بھیڑیوں کا میدان جنگ نہ بنے گی تو اور کیا بنے گی؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم اس نظام اجتماعی کو فاسد سمجھتے ہیں جو ان تین اصولوں کی بنیاد پر بنے۔ ہماری دشمنی لادینی قومی جمہوری نظام سے ہے، خواہ اس کے قائم کرنے اور چلانے والے مغربی ہوں یا مشرقی، غیر مسلم ہوں یا نام نہاد مسلمان۔ جہاں جس ملک اور جس قوم پر بھی یہ بلا مسلط ہوگی، ہم بندگان خدا کو اس سے ہوشیار کرنے کی فکر کریں گے اور انہیں دعوت دیں گے کہ اسے دفع کرو۔

ان تین اصولوں کے جواب میں ہم دوسرے تین اصول پیش کرتے ہیں اور سب انسانوں کے ضمیر سے اپیل کرتے ہیں کہ انہیں جانچ کر پرکھ کر خود دیکھ لو کہ تمہارا اپنا بھلا اور ساری دنیا کا بھلا ان پاک اصول میں ہے یا ان خبیث اصولوں میں؟

۱۔ لادینی کے مقابلے میں خدا کی بندگی و اطاعت۔

۲۔ قوم پرستی کے مقابلے میں انسانیت۔

۳۔ جمہور کی حاکمیت کے مقابلے میں خدا کی حاکمیت و جمہور کی خلافت۔

پہلے اصول کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اس خدا کو اپنا آقا تسلیم کریں جو ہمارا اور تمام کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ ہم اس سے آزاد اور بے نیاز بن کر نہیں بل کہ اس کے تابع

فرمان اور اس کی رہنمائی کے پیرو بن کر زندگی بسر کریں۔ ہم صرف اس کی پوجا ہی نہ کریں بل کہ اس کی اطاعت اور بندگی بھی کریں۔ ہم صرف فرداً فرداً اپنی پرائیوٹ حیثیت ہی میں اس کے احکام اور ہدایات کے پابند نہ ہوں بل کہ اپنی اجتماعی زندگی کے بھی ہر پہلو میں اسی کے پابند ہوں۔ ہماری معاشرت، ہمارا تمدن، ہماری معیشت، ہمارا نظام تعلیم و تربیت، ہمارے قوانین، ہماری عدالتیں، ہماری حکومت، ہماری صلح و جنگ اور ہمارے بین الاقوامی تعلقات، سب کے سب ان اصولوں اور حدوں کے پابند ہوں جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔ ہم اپنے دنیوی معاملات کو طے کرنے میں بالکل آزاد نہ ہوں بل کہ ہماری آزادی ان سرحدوں کے اندر محدود ہو جو خدا کے مقرر کیے ہوئے اصول اور حدود نے کھینچ دی ہیں۔ یہ اصول اور حدود ہر حال میں ہمارے اختیارات سے بالاتر رہیں۔

دوسرے اصول کا مطلب یہ ہے کہ خدا پرستی کی بنیاد پر جو نظام زندگی بنے اس میں قوم، نسل، وطن، رنگ اور زبان کے فرق و امتیاز کی بنا پر کسی قسم کے تعصبات اور خود غرضیاں راہ نہ پائیں۔ وہ ایک قومی نظام کے بہ جائے ایک اصولی نظام ہونا چاہیے جس کے دروازے ہر اس انسان کے لیے کھلے ہوئے ہوں جو اس کے بنیادی اصولوں کو مان لے، اور جو انسان بھی ان کو مان جائے وہ بغیر کسی امتیاز کے پورے مساویانہ حقوق کے ساتھ اس میں شریک ہو سکے۔ اس نظام میں شہریت (Citizenship) محض ایک ریاست کے جغرافیائی حدود تک محدود نہ رہے۔ بل کہ اصولی بنیادوں پر عام ہو۔ جو لوگ ان اصولوں پر مطمئن نہ ہوں یا کسی وجہ سے ان کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، ان کو مٹانے اور دبانے اور ہضم کرنے کی کوشش نہ ہو بل کہ وہ متعین حقوق کے ساتھ اس نظام کی حفاظت (Protection) میں رہیں اور ان کے لیے ہر وقت یہ موقع کھلا رہے کہ جب بھی ان اصولوں کی صحت و تن درستی پر ان کا اطمینان ہو جائے وہ برابر کے حقوق کے ساتھ اپنی آزادانہ مرضی سے اس نظام کے کارفرما بن سکیں ـــــ یہ چیز جس کو ہم اصول انسانیت سے تعبیر کر رہے ہیں قومیت کی نفی نہیں کرتی بل کہ اسے اس کی صحیح فطری حد میں رکھتی ہے۔ اس میں قومی محبت کے لیے جگہ ہے، مگر قومی تعصب کے لیے جگہ نہیں ہے۔ قومی خیر خواہی جائز ہے مگر قومی خود غرضی حرام ہے۔ قومی آزادی مسلم ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کے خود غرضانہ تسلط سے بھی سخت انکار ہے۔ مگر ایسی قومی آزادی ہرگز تسلیم نہیں ہے جو انسانیت کو ناقابل عبور سرحدوں میں

تقسیم کر دے۔ اصول انسانیت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر چہ ہر قوم اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور کوئی قوم من حیث القوم دوسری قوم کی تابع نہ ہو، لیکن تمام وہ قومیں جو تہذیب انسانی کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو جائیں ان کے درمیان انسانی فلاح و ترقی کے کاموں میں پورا تعاون ہو۔ مسابقت (Competition) کے بہ جائے معاونت ہو، باہم امتیازات اور تعصبات اور تفریقیں نہ ہوں۔ تہذیب و تمدن اور اسباب زندگی کا آزادانہ لین دین ہو، اور اس مہذب نظام زندگی کے تحت زندگی بسر کرنے والی دنیا کا ہر انسان اس پوری دنیا کا شہری ہو نہ کہ ایک ملک اور ایک قوم کا، حتیٰ کہ وہ کہہ سکے کہ ''ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست'' موجودہ حالت کو ہم ایک قابل نفرت حالت سمجھتے ہیں جس میں ایک انسان نہ تو خود ہی اپنی قوم اور ملک کے سوا کسی دوسری قوم اور ملک کا وفادار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم اپنے افراد کے سوا دوسری کسی قوم کے افراد پر اعتماد کر سکتی ہے۔ آدمی اپنے ملک کے حدود سے باہر نکلتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کی زمین میں ہر جگہ اس کے لیے رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں۔ ہر جگہ وہ چوروں اور اچکوں کی طرح شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر جگہ پوچھ گچھ ہے، تلاشیاں ہیں، زبان و قلم اور نقل و حرکت پر پابندیاں ہیں، اور کہیں اس کے لیے نہ آزادی ہے نہ حقوق۔ ہم اس کے مقابلے میں ایسا عالم گیر نظام چاہتے ہیں جس میں اصولوں کی وحدت کو بنیاد بنا کر قوموں کے درمیان وفاق قائم ہو اور اس وفاق میں بالکل مساویانہ اور مشترک شہریت (Common Citizenship) اور قطعاً بے روک ٹوک آمد و رفت کا طریقہ رائج ہو۔ ہماری آنکھیں پھر ایک دفعہ یہ منظر دیکھنا چاہتی ہیں کہ آج کا کوئی ابن بطوطہ اٹلانٹک کے ساحل سے بحر الکاہل کے ساحل تک اس طرح جائے کہ کہیں وہ غیر (Foreigner) نہ ہو اور ہر جگہ اس کے لیے جج، مجسٹریٹ، وزیر یا سفیر بن جانے کا موقع ہو۔

اب تیسرے اصول کو لیجیے۔ ہم جمہوری حاکمیت کے بہ جائے جمہوری خلافت کے قائل ہیں۔ شخصی بادشاہی (Monarchy) اور امیروں کے اقتدار اور طبقوں کی اجارہ داری کے ہم بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنا موجودہ زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پرست ہو سکتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کے یکساں حقوق، مساویانہ حیثیت اور کھلے مواقع پر ہمیں بھی اتنا ہی اصرار ہے جتنا مغربی جمہوریت کے کسی بڑے سے بڑے حامی کو ہو سکتا ہے۔ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت کا انتظام اور حکم رانوں کا انتخاب تمام باشندوں کی آزادانہ مرضی اور رائے

سے ہونا چاہیے۔ ہم بھی اس نظام زندگی کے سخت مخالف ہیں جس میں لوگوں کے لیے اظہار رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی اور سعی و عمل کی آزادی نہ ہو، یا جس میں پیدایش اور نسل اور طبقات کی بنا پر بعض لوگوں کے لیے مخصوص حقوق اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے مخصوص رکاوٹیں ہوں۔ یہ امور جو جمہوریت کا اصل جوہر (Essence) ہیں، ان میں ہماری جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے، جو اہل مغرب نے ہمیں سکھائی ہو۔ ہم اس جمہوریت کو اس وقت سے جانتے ہیں اور دنیا کو اس کا بہترین عملی نمونہ دکھا چکے ہیں جب کہ مغربی جمہوریت پرستوں کی پیدایش میں ابھی سینکڑوں برسوں کی دیر تھی۔ دراصل ہمیں اس نوخیز جمہوریت سے جس چیز میں اختلاف اور نہایت سخت اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ وہ جمہور کی مطلق العنان بادشاہی کا اصول پیش کرتی ہے اور ہم اس کو حقیقت کے اعتبار سے غلط اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پادشاہی (Sovereignty) صرف اس کا حق ہے جس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، جو ان کی پرورش اور بالیدگی کا سامان کر رہا ہے جس کے سہارے پر ان کی اور ساری دنیا کی ہستی قائم ہے اور جس کے زبردست قانون کی گرفت میں کائنات کی ایک ایک چیز جکڑی ہوئی ہے۔ اس کی واقعی اور حقیقی بادشاہی کے اندر جس بادشاہی کا بھی دعویٰ کیا جائے گا، خواہ وہ ایک شخص اور ایک خاندان کی بادشاہی ہو یا ایک قوم اور اس کے عوام کی، بہ ہر حال وہ ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اس غلط فہمی کی چوٹ اصل بادشاہ پر نہیں بل کہ اس احمق مدعی پر ہی پڑے گی جس نے اپنی قدر خود نہ پہچانی۔ اس حقیقت کی موجودگی میں صحیح بھی یہی ہے اور نتائج کے اعتبار سے انسان کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ خدا کو حاکم مان کر انسانی زندگی کا نظام حکومت خلافت و نیابت کے نظریے پر بنایا جائے۔ یہ خلافت بلاشبہ جمہوری ہونی چاہیے۔ جمہور کی رائے ہی سے حکومت کے امیر یا ناظم اعلیٰ کا انتخاب ہونا چاہیے۔ ان ہی کی رائے سے اہل شوریٰ منتخب ہونے چاہئیں، اور ان ہی کے مشورے سے حکومت کے سارے انتظامات چلنے چاہئیں، اور ان کو تنقید و احتساب کا کھلا ہوا حق ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سب کچھ اس احساس و شعور کے ساتھ ہونا چاہیے کہ ملک خدا کا ہے، ہم مالک نہیں بل کہ نائب ہیں، اور ہمیں اپنے ہر کام کا حساب اصل مالک کو دینا ہے۔ نیز وہ اخلاقی اصول اور قانونی احکام اور حدود اپنی جگہ اٹل ہونے چاہئیں جو خدا نے ہماری زندگی کے لیے مقرر کر دیے

ہیں۔ ہماری پارلیمنٹ کا اساسی نظریہ یہ ہونا چاہیے کہ جن امور میں خدا نے ہمیں ہدایات دی ہیں ان میں ہم قانون سازی نہیں کریں گے بل کہ اپنی ضروریات کے لیے خدا کی ہدایات سے تفصیلی قوانین اخذ کریں گے، اور جن امور میں خدا نے ہدایات نہیں دی ہیں ان میں ہم یہ سمجھیں گے کہ خدا نے خود ہی ہم کو آزادیِ عمل بخشی ہے اس لیے صرف ان ہی امور میں ہم باہمی مشورے سے قوانین بنائیں گے مگر یہ قوانین لازماً اس مجموعی سانچے کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے ہوں گے جو خدا کی اصولی ہدایات نے ہمارے لیے بنادیا ہے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ اس پورے نظام تمدن وسیاست کی کارفرمائی اور اس کا انتظام ان لوگوں کے سپرد ہو جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے اور ہر کام میں اس کی رضا چاہنے والے ہوں جن کی زندگی گواہ ہو کہ وہ خدا کے حضور اپنی پیشی اور جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں، جن کی پبلک اور پرائیوٹ دونوں قسم کی زندگیوں سے یہ شہادت ملے کہ وہ بے لگام گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جو ہر کھیت میں چرتا اور ہر حد کو پھاندتا پھرتا ہو بل کہ ایک الٰہی ضابطے کی رسی سے بندھے ہوے اور ایک خدا پرستی کے کھونٹے سے مربوط ہیں، اور ان کی ساری چلت پھرت اسی حد تک محدود ہے جہاں تک وہ رسی انہیں جانے دیتی ہے۔

حضرات! یہ تینوں اصول جن کی بہت ہی مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، موجودہ تہذیب کی قوم پرستانہ لادینی جمہوری حاکمیت کے مقابلے میں ایک خدا پرستانہ انسانی جمہوری خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی کا قیام ہمارا نصب العین ہے۔ یہ بات تو آپ بہ یک نظر معلوم کرسکتے ہیں کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان کھلا ہوا اختلاف ہے۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اپنے ضمیر پر منحصر ہے کہ ان میں سے کون بہتر ہے، کس میں آپ کی فلاح ہے، کس کے قیام کا آپ کو خواہش مند ہونا چاہیے اور کس کے قائم کرنے اور قائم رکھنے میں آپ کی قوتیں صرف ہونی چاہئیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان سے تو میں صاف کہتا ہوں کہ موجودہ زمانے کی لادینی قومی جمہوریت تمہارے دین وایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ جس اسلام کے نام پر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو اس کی روح اس نظام کی روح سے، اس کے بنیادی اصول اس کے بنیادی اصولوں سے اور اس کا ہر جزو اس کے ہر جزو سے متصادم ہے۔ اسلام اور یہ نظام ایک دوسرے سے کہیں بھی مصالحت نہیں کرتے۔ جہاں یہ نظام برسراقتدار ہوگا وہاں اسلام نقش برآب رہے گا اور جہاں اسلام برسراقتدار ہوگا وہاں اس نظام کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم اگر واقعی اسی اسلام پر

ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد ﷺ لائے تھے تو تمہارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو اس قوم پرستانہ لادینی جمہوریت کے مقابلے میں خدا پرستانہ انسانی خلافت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرو۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں تم بہ حیثیت ایک قوم کے برسراقتدار ہو وہاں تو اگر تمہارے اپنے ہاتھوں سے اسلام کے اصلی نظام کے بہ جائے یہ کافرانہ نظام بنے اور چلے تو حیف ہے تمہاری اس جھوٹی مسلمانی پر جس کا نام لینے میں تم اتنے بلند آہنگ اور جس کا کام کرنے میں تم اتنے جی چور ہو۔

اس سلسلے میں جملہ معترضہ کے طور پر اپنے مسلمان بھائیوں سے مجھے ایک بات اور بھی کہنی ہے۔ بعض مذہبی جامہ پہننے والے لوگ آپ کو اس غلط فہمی میں ڈال رہے ہیں اور شاید خود بھی اس دھوکے میں ہیں کہ ”حکومت تو ایک انعام ہے جو نمازیں پڑھنے اور نیکیاں کرنے کے صلے میں خدا کی طرف سے ملا کرتا ہے، اس کے حصول کی کوشش محض دنیا پرستی اور اس کو نصب العین بنانا خلاف اسلام ہے۔“ یہ باتیں جو لوگ کرتے ہیں انہوں نے اس معاملے کو سرے سے سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی ہے، اور اگر وہ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ وہ سمجھنا چاہتے بھی نہیں ہیں، کیوں کہ اس طرح وہ عیش منغص ہو جائے گا جو موجودہ نظام کی فرماں روائی میں ان کو حاصل ہے، یا حاصل ہونے کا لالچ ہے۔ یہ لوگ اس سارے معاملہ کو انعام کے پہلو سے دیکھ رہے ہیں اور فرض کا پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بے شک خلافت الٰہیہ کا قائم ہو جانا ایک انعام ہے مگر اس کے قیام کی کوشش کرنا ایک فرض بھی تو ہے تاکہ خلافت شیطانیہ کی جگہ وہ نظام حق برپا ہو جس میں برائیاں دبیں اور نیکیاں پروان چڑھ سکیں۔ تم فرض سے جی چراتے ہو اور انعام کی امید رکھتے ہو؟ یہ بوالفضولی تمہیں کو مبارک رہے!

رہے غیر مسلم حضرات، تو ان سے میری خیر خواہانہ گزارش یہ ہے کہ براہ کرم اصول کے معاملے میں ان تعصّبات کے قفل اپنے دلوں پر نہ چڑھایئے جو پچھلی تاریخ اور آج کی کش مکش کی وجہ سے ہمارے اور آپ کے درمیان پیدا ہو گئے ہیں اصول کسی قوم کی آبائی جائداد نہیں ہوتے، نہ ان پر کسی قومیت کا ٹھپا لگا ہوا ہوتا ہے وہ اگر صحیح اور مفید ہیں تو سب انسانوں کے لیے صحیح اور مفید ہیں، اور اگر غلط ہیں تو سب ہی کے لیے غلط ہیں، بلالحاظ اس کے کہ کون ان کا پیش کرنے والا ہے اور کس زبان میں انھیں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حفظان صحت کے اصولوں میں، طب کے اصولوں میں، تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت کے اصولوں میں، سائنس اور دوسرے علوم و

فنون کے اصولوں میں یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ فلاں ملک اور فلاں قوم کی چیزیں ہیں اس لیے دوسرے ان سے تعصب کریں۔ آپ جس صحیح اصول کو قبول کرنے میں بھی تعصب سے کام لیں گے اپنا ہی نقصان کریں گے، بالکل یہی معاملہ اخلاق، تمدن، معاشرت، تہذیب، معیشت اور سیاست کے اصولوں کا بھی ہے۔ یہ بھی درحقیقت غیر قومی اور غیر نسلی چیزیں ہیں۔ ان کو بھی ان کے حسن و قبح (Merit and Demerit) ہی کے لحاظ سے قبول یا رد کرنا چاہیے۔ آپ صحیح اصول اختیار کریں گے تو اپنا بھلا کریں گے، کسی پر کوئی احسان نہ کریں گے۔ غلط اصولوں کی پیروی کریں گے تو اپنا نقصان کریں گے۔ کسی کا کچھ نہ بگاڑیں گے۔

آپ نے خود بھی دنیا کے دوسرے اصولوں کے معاملے میں تعصب نہیں برتا ہے۔ یہ لادینی، یہ قوم پرستی، یہ مغربی جمہوریت آپ کے پاس ان انگریزوں ہی کے ذریعے سے تو آئی ہے جو دو سو برس آپ پر ظالمانہ حکومت کرتے رہے اور جن کے خلاف چالیس پچاس سال آپ آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ پھر ان دشمنوں کے لائے ہوئے اصولوں کو قبول کرنے میں آپ نے کیوں تعصب سے کام نہ لیا؟ یہ سوشلزم اور کمیونزم جن کی طرف آپ میں سے بہت سے لوگ لپک رہے ہیں جرمنی کے ایک یہودی دماغ سے نکلے اور روس میں پروان چڑھے۔ ان قوموں سے آخر آپ کا کیا رشتہ ہے؟ پھر آپ نے انہیں اجنبی کیوں نہ سمجھا؟ اگر ان کے معاملے میں آپ تعصب کو بالائے طاق رکھ سکتے ہیں اور اصول کو اصول ہی کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ جو اصول ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان پر غور کرنے میں یہ خیال آپ کی نظر و فکر کو الجھا دے کہ ان کے پیش کرنے والے لوگ ایسی قوم کے افراد ہیں جس سے آپ کچھ تاریخی شکایات رکھتے ہیں یا جس کے ساتھ آج آپ کی لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔

ہم دلائل کے ساتھ ان غلط اصولوں پر تنقید کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک انسانیت کے لیے تباہ کن ہیں اور ان کے جواب میں وہ اصول پیش کر رہے ہیں جن کے اندر ہمیں اپنی، آپ کی، اور سب انسانوں کی فلاح نظر آتی ہے۔ آپ کھلے دل سے دیکھیے کہ آپ کا اپنا بھلا فی الواقع کن اصولوں کی پیروی میں ہے۔ خود جانچ کر دیکھ لیجیے کہ خدا پرستی بہتر ہے یا بے دینی، قوم پرستی بہتر ہے، یا انسانیت، جمہور کی مطلق العنانی بہتر ہے یا خدا کی بادشاہی کے تحت جمہوری خلافت، انسانی معاملات کی باگیں خدا سے بے خوف لوگوں کے ہاتھوں میں رہنی بہتر ہے یا ایسے

لوگوں کے ہاتھوں میں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ اگر آپ کا دل گواہی دے کہ یہ چیز جو ہم پیش کر رہے ہیں زیادہ صحیح اور نتائج کے لحاظ سے زیادہ اچھی ہے تو اسے اختیار کر کے آپ خود اپنی ہی خیر خواہی کریں گے۔

اس کے بعد صرف عملی سوال حل طلب باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس خدا پرستانہ نظام کو چلانے کے لیے ہدایات کہاں سے حاصل کی جائیں؟ وہ خدائی قانون وہ دستور کون سا ہے جس پر ہم اپنی ریاست کی بنیاد رکھیں؟ بہ ظاہر یہ سوال بہت پیچیدہ ہے، کیوں کہ جس آسانی کے ساتھ حکومت الٰہیہ، رام راج یا (Kingdom of God) کے سادہ تصور پر لوگوں کے درمیان اتفاق ہوسکتا ہے، اسی آسانی کے ساتھ کسی دستور و قانون کو خدائی دستور و قانون کی حیثیت سے قبول کر لینے پر اتفاق نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ پیچیدگی ایسی سخت نہیں ہے کہ اس کو کسی طرح رفع کیا ہی نہ جا سکتا ہو۔

اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصے میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عام کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں، جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلے میں یہ خدا پرستانہ جمہوری خلافت، جو محمد ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی، کہاں تک خود باشندگان پاکستان کے لیے اور کہاں تک تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں آپ کی اکثریت اور ہماری اقلیت ہوگی۔ وہاں ہم آپ سے عرض کریں گے کہ خدارا دنیا کی بگڑی ہوئی قوموں سے وہ اصول نہ لیجیے جن کی وجہ سے وہ خود بھی خراب ہو رہی ہیں اور دنیا کو بھی خراب کر رہی ہیں ان کے بجائے آپ پہلے یہ تین اصول مان لیجیے جن کو ہر زمانے میں خدا کے نیک بندے لے کر آئے ہیں، جنہیں آپ کے بزرگ بھی اسی طرح پیش کرتے تھے جس طرح ہمارے بزرگوں نے پیش کیا تھا۔ پھر اپنے بزرگوں کی تعلیمات میں تلاش کیجیے کہ ان اصولوں کے مطابق ایک ریاست ــــ زمانۂ حال کی ایک ترقی پذیر ریاست ــــ کا نظام چلانے کے لیے کوئی مفصل ہدایت ملتی ہے یا نہیں۔ رام چندر جی، کرشن جی، بودھ مہاراج، گورونانک اور دوسرے

تمام رشیوں اور منیوں کی تعلیم اور ان کی سیرتوں کا جائزہ لیجیے۔ ویدوں اور پرانوں اور شاستروں اور گرنتھوں کو دیکھیے کہ اگر ان میں کوئی ہدایت آپ کو ملے تو ہم کہیں گے کہ آپ ہندستان کی ریاست کا نظام اسی پر قائم کیجیے اور ہم سے وہی برتاؤ کیجیے جو آپ کا دین ہمارے لیے تجویز کرتا ہے۔ ہم اس نظام کی مزاحمت نہیں کریں گے۔ اسے کام کرنے کا پورا موقع دیں گے اور بغیر کسی تعصب کے یہ دیکھیں گے کہ آپ خدا پرستی، انسانیت اور خدا پرستانہ جمہوریت کی جو عملی تعبیر پیش کرتے ہیں وہ کہاں تک ہندستان کے لیے اور کہاں تک دنیا کے لیے رحمت و برکت کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے ہاں ایسا کوئی مفصل ہدایت نامہ نہ پائیں، تو اس کے معنی یہ نہیں، کہ وہ خدا نے آپ کے ہاں بھیجا نہیں تھا، بل کہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اپنی طویل تاریخ کے انقلاب میں اسے یا اس کے ایک بڑے حصے کو آپ کھو بیٹھے ہیں۔ وہی چیز اس خدا کی بھیجی ہوئی، ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس سے اپرآ یئے نہیں، یہ آپ ہی کی کھوئی ہوئی چیز ہے جو ایک دوسرے ذریعے سے آپ کے پاس واپس آئی ہے۔ آپ اسے پہچاننے کی کوشش کریں، اسے جانچیں پرکھیں اور برت کر دیکھیں کہ اس میں واقعی آپ کی اور دنیا کی فلاح ہے یا نہیں؟

دعوت اسلامی
اور
اس کا طریقِ کار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

سب سے پہلے میں اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہمیں ایک نہایت خشک دعوت اور نہایت بے مزا طریق کار کو بالآخر لوگون کے لیے دل چسپ وخوش ذائقہ بنانے میں توقع سے زیادہ کام یابی عطا کی۔ ہم جس دعوت کو لے کر اٹھے تھے اس سے زیادہ کاسد جنس آج دنیا کی دعوتوں کے بازار میں اور کوئی نہ تھی۔ اور اس کے لیے جو طریق کار ہم نے اختیار کیا، اس کے اندران چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی جو آج کل دنیا کی دعوتوں کے پھیلانے میں اور خلق کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ نہ جلسے نہ جلوس، نہ نعرے نہ جھنڈے، نہ مظاہرے نہ نمایشیں، نہ تقریریں نہ وعظ۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں اور یہ دیکھ کر ہمارا دل شکر وسپاس کے جذبے سے لبریز ہو جاتا ہے کہ بندگان خدا روز بروز کثرت کے ساتھ ہماری اس دعوت کی طرف کھنچ رہے ہیں اور ہمارے بے لطف اجتماعات میں شرکت کے لیے دور دور سے بغیر کسی طلب کے آتے ہیں۔ یہ کشش بہ ہر حال حق ہی کی کشش ہے۔ کیوں کہ ہمارے پاس حق کے سوا کوئی اور چیز کھینچنے والی سرے سے ہے ہی نہیں۔

اجتماعات کا مقصد

ہمارے ان اجتماعات کا مقصد کوئی مظاہرہ کرنا اور ہنگامہ برپا کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا نہیں ہے۔ ہماری غرض ان سے صرف یہ ہے کہ ہمارے ارکان ایک دوسرے سے متعارف اور مربوط ہوں۔ ان کے درمیان اجنبیت اور ناآشنائی باقی نہ رہے۔ وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں اور باہمی مشورے سے تعاون کی صورتیں نکالیں۔ اور اپنے کام کو آگے بڑھانے اور مشکلات راہ اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پیش نظر ان اجتماعات سے یہ فائدہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے کام کا جائزہ لینے اور اس کی کمزوریوں کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے کا وقتاً فوقتاً موقع ملتا رہتا ہے۔ نیز جو لوگ ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں یا ہمارے خیالات سے متاثر ہیں یا ہمارے کام کے متعلق کچھ شکوک وشبہات رکھتے ہیں ان کو بھی یہ موقع مل جاتا ہے کہ بالمشافہ ہماری دعوت اور ہمارے کام کو سمجھیں اور اگر ان کا دل گواہی دے کہ ہم واقعی حق پر ہیں تو ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بہت سی غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ صرف دوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، اور بڑھتی رہتی ہیں۔ محض قرب اور مشاہدہ اور معائنہ اور شخصی تعلق ہی ایسی غلط فہمیوں کو رفع کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان حضرات کے بھی شکر گزار ہیں، جو اپنا وقت اور اپنا مال صرف کر کے ہمارے ان اجتماعات میں محض ہماری بات کو سمجھنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ہم ان کی اس جستجوئے حق کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ جہاں ان کی دل چسپی کا کوئی سامان نہیں ہے وہاں وہ محض اس وجہ سے آتے ہیں کہ اللہ کے کچھ بندے جو اللہ کا نام لے کر ایک کام کر رہے ہیں ان کے متعلق تحقیق کریں کہ واقعی ان کا کام کس حد تک اللہ کا ہے، اور اللہ کے لیے ہے۔ یہ مخلصانہ حق جوئی اگر ذہن و دماغ کی صفائی کے ساتھ بھی ہو تو اللہ ان کی سعی و جستجو کو ضائع نہ ہونے دے گا۔ اور ضرور انھیں حق کے نشانات راہ دکھائے گا۔

چوں کہ یہاں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری دعوت اور ہمارا مقصد کیا ہے، اور کس طریقے سے ہم اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے سب سے پہلے میں ان ہی دو امور پر کچھ عرض کروں گا۔

ہماری دعوت کیا ہے؟

ہماری دعوت کے متعلق عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت دیتے ہیں۔ حکومت الٰہیہ کا لفظ کچھ تو غلط فہمی پیدا کرتا ہے، اور کچھ اسے غلط فہمی پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں اور انہیں ایسا سمجھایا بھی جاتا ہے کہ حکومت الٰہیہ سے مراد محض ایک سیاسی نظام ہے اور ہماری غرض اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وہ مخصوص سیاسی نظام قائم ہو۔ پھر چوں کہ اس سیاسی نظام کے چلانے والے لامحالہ وہی مسلمان ہوں گے جو اس کے قیام کی تحریک میں حصہ لے رہے ہوں اس لیے خود بہ خود اس تصور میں سے یہ معنی نکل آتے ہیں یا ہوش یاری کے ساتھ نکال لیے جاتے ہیں کہ ہم محض حکومت چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دین دارانہ وعظ شروع ہوتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پیش نظر محض دنیا ہے حالاں کہ مسلمان کے پیش نظر دین اور آخرت ہونی چاہیے اور یہ کہ حکومت طلب کرنے کی چیز نہیں ہے بل کہ ایک انعام ہے جو دین دارانہ زندگی کے صلے میں اللہ کی طرف سے مل جاتا ہے۔ یہ باتیں کہیں تو نافہمی کے ساتھ کہی جاتی ہیں اور کہیں نہایت ہوش مندی کے ساتھ اس غرض کے لیے کہ اگر ہمیں نہیں تو کم سے کم خلق خدا کے ایک بڑے حصے کو بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کیا جائے۔ حالاں کہ اگر کوئی شخص ہمارے لٹریچر کو کھلے دل کے ساتھ پڑھے تو اس پر بہ آسانی یہ بات کھل سکتی ہے کہ ہمارے پیش نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے بل کہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی ـــــ انفرادی و اجتماعی ـــــ میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو، جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے۔ جس کے لیے اللہ نے اپنے انبیاء کو مبعوث کیا تھا، اور جس کی دعوت دینے اور جدوجہد کرنے کے لیے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی امامت و رہنمائی میں امت مسلمہ کے نام سے ایک گروہ بنتا رہا ہے۔

دعوت اسلامی کے تین نکات

اگر ہم اپنی اس دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات پر مشتمل ہوگی۔

۱۔ یہ کہ ہم بندگان خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

۲۔ یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کردے اور جب وہ مسلمان ہے، یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔

۳۔ یہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فسّاق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرماں روائی میں چل رہا ہے اور معاملات دنیا کے نظام کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی و امامت نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔

یہ تینوں نکات اگرچہ اپنی جگہ بالکل صاف ہیں، لیکن ایک مدت دراز سے ان پر غفلتوں اور غلط فہمیوں کے پردے پڑے رہے ہیں، اس لیے بدقسمتی سے آج غیر مسلموں کے سامنے ہی نہیں، بل کہ مسلمانوں کے سامنے بھی ان کی تشریح کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

بندگیِ رب کا حقیقی مفہوم

اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کو خدا اور اپنے آپ کو خدا کا بندہ تو مان لیا جائے مگر اس کے بعد اخلاقی و عملی اور اجتماعی زندگی ویسی کی ویسی ہی رہے جیسی خدا کو نہ ماننے اور اس کی بندگی کا اعتراف نہ کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ خدا کو فوق الفطری طریقے پر خالق اور رازق اور معبود تسلیم کر لیا جائے مگر عملی زندگی کی فرماں روائی و حکم رانی سے اس کو بے دخل کر دیا جائے۔ اسی طرح خدا کی بندگی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور صرف مذہبی زندگی میں جس کا تعلق عقائد اور عبادات اور حرام و حلال کی چند محدود قیود سے سمجھا جاتا ہے خدا کی بندگی کی جائے۔ باقی رہے دنیاوی معاملات جو تمدن، معاشرت، سیاست، معیشت، علوم و فنون اور ادب وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں تو ان میں انسان خدا کی بندگی سے بالکل آزاد رہے اور جس نظام کو چاہے خود وضع کرے یا دوسروں کے وضع کیے

ہوئے کو اختیار کر لے۔ بندگی رب کے ان سب مفہومات کو ہم سراسر غلط سمجھتے ہیں۔ ان کو مٹانا چاہتے ہیں اور ہماری لڑائی جتنی شدت کے ساتھ نظام کفر کے ساتھ ہے اتنی بل کہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ بندگی کے ان مفہومات کے خلاف ہے۔ کیوں کہ ان کی بہ دولت دین کا تصور ہی سرے سے مسخ ہو گیا ہے ہمارے نزدیک قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابیں، اور محمد ﷺ اور آپؐ سے پہلے تمام پیغمبر جو دنیا کے مختلف گوشوں میں آئے، ان کی بالا تفاق دعوت جس بندگی رب کی طرف تھی، وہ یہ تھی کہ انسان خدا کو پورے معنیٰ میں الٰہ اور رب، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہنما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی (جزا دینے والا) تسلیم کرے، اور اپنی پوری زندگی کو خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی وسیاسی اور معاشی ہو یا علمی اور نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے۔ یہی مطالبہ ہے جو قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ اُدخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یعنی اپنی زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے کو بندگی رب سے محفوظ کر کے نہ رکھو۔ اپنے تمام وجود کے ساتھ، اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کی غلامی و اطاعت میں آجاؤ۔ زندگی کے کسی معاملے میں بھی تمہارا یہ طرز عمل نہ ہو کہ اپنے آپ کو خدا کی بندگی سے آزاد رکھو اور اس کی رہنمائی و ہدایت سے مستغنی ہو کر اور اس کے مقابلے میں خود مختار بن کر یا کسی خود مختار بنے ہوئے بندے کے پیرو یا مطیع ہو کر وہ راہ چلنے لگو، جس کی ہدایت خود خدا نے نہ دی ہو۔ بندگی کا یہی وہ مفہوم ہے جس کی ہم تبلیغ کرتے ہیں اور جسے قبول کرنے کی سب لوگوں کو مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو دعوت دیتے ہیں۔

منافقت کی حقیقت

دوسری چیز جس کی ہم دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے، یا اسلام قبول کرنے والے سب لوگ منافقانہ رویے کو بھی چھوڑیں اور اپنی زندگی کو تناقضات سے بھی پاک کریں۔ منافقانہ رویے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس دین کی پیروی کا دعویٰ کرے اس کے بالکل برخلاف نظام زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلط پا کر راضی اور مطمئن رہے۔ اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی سعی نہ کرے بل کہ اس کے برعکس اسی فاسقانہ و باغیانہ نظام زندگی کو اپنے لیے سازگار بنانے اور اس میں اپنے لیے آرام کی جگہ پیدا

کرنے کی فکر کرتا رہے یا اگر اس کو بدلنے کی کوشش بھی کرے تو اس کی غرض یہ نہ ہو کہ اس فاسقانہ نظام زندگی کی جگہ دین حق قائم ہو بلکہ صرف یہ کوشش کرے کہ ایک فاسقانہ نظام ہٹ کر، دوسرا فاسقانہ نظام اس کی جگہ قائم ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ طرز عمل سراسر منافقانہ ہے اس لیے کہ ہمارا ایک نظام زندگی پر ایمان رکھنا، اور دوسرے نظام زندگی میں راضی رہنا بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مخلصانہ ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جس طریق زندگی پر ہم ایمان رکھتے ہیں اسی کو ہم اپنا قانون حیات دیکھنا چاہیں، اور ہماری روح اپنی آخری گہرائیوں تک ہر اس رکاوٹ کے پیش آجانے پر بے چین و مضطرب ہو جائے جو اس طریق زندگی کے مطابق جینے میں سد راہ بن رہی ہو۔ ایمان تو ایسی کسی چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کجا کہ اس کا پورا کا پورا دین کسی دوسرے نظام زندگی کا تابع مہمل بن کر رہ گیا ہو۔ اس دین کے کچھ اجزاء پر عمل ہوتا بھی ہو، تو صرف اس وجہ سے کہ غالب نظام زندگی نے ان کو بے ضرر سمجھ کر رعایۃً باقی رکھا ہو، اور ان رعایات کے ماسوا ساری زندگی کے معاملات دین کی بنیادوں سے ہٹ کر غالب نظام زندگی کے بنیادوں پر چل رہے ہوں اور پھر بھی ایمان اپنی جگہ نہ صرف خوش اور مطمئن ہو بلکہ جو کچھ بھی سوچے اسی غلبۂ کفر کو اصول موضوعہ کے طور پر تسلیم کر کے سوچے۔ اس قسم کا ایمان چاہے فقہی اعتبار سے معتبر ہو لیکن دینی لحاظ سے تو اس میں اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے اور قرآن کی متعدد آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ حقیقت میں نفاق ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ بھی اپنے آپ کو بندگی رب کے اس مفہوم کے مطابق جس کی ابھی میں نے تشریح کی ہے خدائے واحد کی بندگی میں دینے کا اقرار کریں ان کی زندگی اس نفاق سے پاک ہو۔ بندگی حق کے اس مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سچے دل سے یہ چاہیں کہ جو طریق زندگی، جو قانون حیات، جو اصول تمدن و اخلاق و معاشرت و سیاست، جو نظام فکر و عمل، اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے واسطے سے ہمیں دیا ہے ہماری زندگی کا پورا پورا کاروبار اسی کی پیروی میں چلے اور ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شعبے کے اندر بھی اس نظام حق کے خلاف کسی دوسرے نظام کے تسلط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اب آپ خود سمجھ لیں کہ نظام باطل کے تسلط کو برداشت کرنا بھی، جب کہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہو، تو اس پر راضی و مطمئن رہنا اور

اس کے قیام وبقا کی سعی میں حصہ لینا، یا ایک نظام باطل کی جگہ دوسرے نظام باطل کو سرفراز کرنے کی کوشش کرنا ایمان کے ساتھ کیسے میل کھا سکتا ہے؟

تناقض کی حقیقت

اس نفاق کے بعد دوسری چیز جس کو ہم پرانے اور نئے مسلمان کی زندگی سے خارج کرنا چاہتے ہیں، اور جس کے خارج کرنے کی ہر مدعی ایمان کو دعوت دیتے ہیں وہ تناقض ہے۔ تناقض سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس چیز کا زبان سے دعویٰ کرے عمل سے اس کی خلاف ورزی کرے۔ نیز یہ بھی تناقض ہے کہ آدمی کا اپنا عمل ایک معاملے میں کچھ ہو اور دوسرے معاملے میں کچھ اور اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنی پوری زندگی کو خدا کی بندگی میں دے دیا ہے تو اسے جان بوجھ کر کوئی حرکت بھی ایسی نہ کرنی چاہیے جو بندگی رب کی ضد ہے۔ اور اگر بشری کمزوری کی بنا پر ایسی کوئی حرکت اس سے سرزد ہو جائے تو اسے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے پھر بندگی رب کی طرف پلٹنا چاہیے۔ ایمان کے مقتضیات میں سے یہ بھی ایک اہم مقتضا ہے کہ پوری زندگی صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی ہو۔ پچ رنگی اور چورنگی تو درکنار دورنگی زندگی بھی دعوئے ایمان کے ساتھ میل نہیں کھاتی اور ہمارے نزدیک یہ بات بہروپیے پن سے کچھ کم نہیں ہے کہ ہم ایک طرف تو خدا اور آخرت اور وحی اور نبوت اور شریعت کو ماننے کا دعویٰ کریں، اور دوسری طرف دنیا کی طلب میں لپکے ہوئے ان درسگاہوں کی طرف خود دوڑیں، دوسروں کو اس کا شوق دلائیں، اور آپ خود اپنے اہتمام میں ایسی درسگاہیں چلائیں جن میں انسان کو خدا سے دور کرنے والی، آخرت کو بھلا دینے والی، مادہ پرستی میں غرق کر دینے والی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک طرف ہم خدا کی شریعت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کریں، اور دوسری طرف ان عدالتوں کے وکیل اور جج بنیں اور ان ہی عدالتوں کے فیصلوں پر حق اور غیر حق کے فیصلے کا دارومدار رکھیں جو شریعت الٰہی کو ایوان عدالت سے بے دخل کر کے شریعت غیر الٰہی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہوں۔ ایک طرف ہم مسجد میں جا جا کر نمازیں پڑھیں اور دوسری طرف مسجد سے باہر نکلتے ہی اپنے گھر کی زندگی میں، اپنے لین دین میں، اپنی معاش کی فراہمی میں، اپنی شادی بیاہ میں اپنی میراثوں کی تقسیم میں، اپنی سیاسی تحریکوں میں اور اپنے سارے دنیوی معاملات میں خدا اور اس کی شریعت کو بھول کر کہیں اپنے

نفس کے قانون کی، کہیں اپنی برادری کے رواج کی، کہیں اپنی سوسائٹی کے طور طریقوں کی اور کہیں خدا سے پھرے ہوے حکم رانوں کے قوانین کی پیروی میں کام کرنے لگیں۔ ایک طرف ہم اپنے خدا کو بار بار یقین دلائیں کہ ہم تیرے ہی بندے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور دوسری طرف ہر اس بت کی پوجا کریں جس کے ساتھ ہمارے مفاد، ہماری دل چسپیاں اور ہماری محبتیں، اور آسایشیں کچھ بھی وابستگی رکھتی ہوں۔ یہ اور ایسے ہی بے شمار متناقضات جو آج مسلمانوں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، جن کے موجود ہونے سے کوئی ایسا شخص جو بینائی رکھتا ہے انکار نہیں کر سکتا ہمارے نزدیک وہ اصلی گھن ہیں جو امت مسلمہ کی سیرت و اخلاق کو اور اس کے دین و ایمان کو اندر ہی اندر کھائے جاتے ہیں، اور آج زندگی کے ہر پہلو میں مسلمانوں سے جن کم زوریوں کا اظہار ہو رہا ہے، ان کی اصل جڑ یہی تناقضات ہیں۔ ایک مدت تک مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جاتا رہا ہے کہ تم شہادت توحید و رسالت زبان سے ادا کرنے، اور روزہ نماز وغیرہ چند مذہبی اعمال کر لینے کے بعد، خواہ کتنے ہی غیر دینی اور غیر ایمانی طرز عمل اختیار کر جاؤ بہ ہر حال نہ تمہارے اسلام پر کوئی آنچ آ سکتی ہے، اور نہ تمہاری نجات کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اس ڈھیل کی حدود اس حد تک بڑھیں کہ نماز روزہ بھی مسلمان ہونے کے لیے شرط نہ رہا۔ اور مسلمانوں میں عام طور پر یہ تخیل پیدا کر دیا گیا ہے کہ ایک طرف ایمان و اسلام کا اقرار ہو، اور دوسری طرف ساری زندگی اس کی ضد ہو، تب بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً۔ اسی چیز کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے نام کے ساتھ ہر فسق، ہر کفر، ہر معصیت و نافرمانی اور ہر ظلم و سرکشی کا جوڑ آسانی سے لگ جاتا ہے۔ اور مسلمان مشکل ہی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ جن راہوں میں وہ اپنے اوقات، اپنی محنتیں، اپنے مال اور اپنی قوتیں، اور اپنی قابلیتیں اور اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اور جن مقاصد کے پیچھے ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں صرف ہو رہی ہیں وہ اکثر ان کے اس ایمان کی ضد ہیں جس کا وہ دعویٰ رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال جب تک جاری رہے گی اسلام کے دائرے میں نو مسلموں کا داخلہ بھی کوئی مفید نتیجہ نہ پیدا کر سکے گا۔ کیوں کہ جو منتشر افراد اس کانِ نمک میں آتے جائیں گے وہ اسی طرح نمک بنتے چلے جائیں گے۔ پس ہماری دعوت کا ایک لازمی عنصر یہ ہے کہ ہم ہر مدعی ایمان کی زندگی کو ان تناقضات سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یک سو

ہو، یک رنگ مومن و مسلم ہو۔ ہر اس چیز سے کٹ جائے اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریق زندگی کے منافی ہو۔ اور خوب اچھی طرح مقتضیات ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔

امامت میں تغیر کی ضرورت

اب ہماری دعوت کے تیسرے نکتے کو لیجیے۔ ابھی جن دو نکات کی تشریح میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں، یہ تیسرا نکتہ ان میں سے بالکل ایک منطقی نتیجے کے طور پر نکلتا ہے۔ ہمارا اپنے آپ کو بندگی رب کے حوالے کر دینا، اور اس حوالگی و سپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا، بل کہ مخلص ہونا اور پھر ہمارا اپنی زندگی کو تناقضات سے پاک کر کے مسلم حنیف بننے کی کوشش کرنا، لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے، کہ ہم اس نظام زندگی میں انقلاب چاہیں جو آج کفر، دہریت، شرک، فسق و فجور اور بداخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے اور جس کے نقشے بنانے والے مفکرین اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوے اور اس کی شرائع کے قیود سے نکلے ہوے لوگ ہیں۔ جب تک زمام کاران لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی، اور جب تک علوم و فنون، آرٹ اور ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذ قانون، مالیات، صنعت و حرفت، تجارت اور انتظام ملکی اور تعلقات بین الاقوامی ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے ہوے رہیں گے کسی شخص کے لیے دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا، اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا کر رہنا، نہ صرف عملاً محال ہے بل کہ اپنی آیندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا غیر ممکن ہے۔ اس کے علاوہ صحیح معنوں میں جو شخص بندۂ رب ہو، اس پر من جملہ دوسرے فرائض کے اہم ترین فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے مطابق دنیا کے انتظام کو فساد سے پاک کرے اور اصلاح پر قائم کرے اور یہ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک زمام کار صالحین کے ہاتھ میں نہ ہو۔ فساق و فجار اور خدا کے باغی اور شیطان کے مطیع، دنیا کے امام و پیشوا اور منتظم رہیں، اور پھر دنیا میں ظلم و فساد، بداخلاق اور گم راہی کا دور دورہ نہ ہو، یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے اور آج تجربے و مشاہدے سے کالشمس فی النہار ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ پس ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا

متقاضی ہے کہ ہم دنیا کے ائمہ ضلالت کی پیشوائی ختم کردینے اور غلبۂ کفر و شرک کو مٹا کر دین حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔

امامت میں انقلاب کیسے ہوتا ہے؟

مگر یہ تغیر محض چاہنے سے نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بہ ہر حال دنیا کا انتظام چاہتی ہے اور دنیا کے انتظام کے لیے کچھ صلاحیتیں اور قوتیں اور صفات درکار ہیں، جن کے بغیر کوئی گروہ اس انتظام کو ہاتھ میں لینے اور چلانے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ اگر مومنین صالحین کا ایک منظم جتھا ایسا موجود نہ ہو، جو انتظام دنیا کو چلانے کی اہلیت رکھتا ہو، تو پھر مشیت الٰہی غیر مومن اور غیر صالح لوگوں کو اپنی دنیا کا انتظام سونپ دیتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گروہ ایسا موجود ہوجائے جو ایمان بھی رکھتا ہو، صالح بھی ہو اور ان صفات اور صلاحیتوں اور قوتوں میں کفار سے بڑھ جائے جو دنیا کا انتظام چلانے کے لیے ضروری ہیں تو مشیت الٰہی نہ ظالم ہے اور نہ فساد پسند کہ پھر بھی اپنی دنیا کا انتظام فساق و فجار اور کفار ہی کے ہاتھ میں رہنے دے۔ پس ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمام کار فساق و فجار کے ہاتھ سے نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے بلکہ ایجاباً ہماری دعوت یہ ہے کہ اہل ایمان و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یکرنگ اور نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح و پاکیزہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ان تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لیے ضروری ہیں اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے ان اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کردے۔

مخالفت اور اس کے اسباب

یہ ہے ہماری دعوت کا خلاصہ۔ اب آپ تعجب کریں گے اگر میں آپ کو بتاؤں کہ اس دعوت کی مزاحمت اور مخالفت سب سے پہلے جس گروہ کی طرف سے ہوئی ہے وہ مسلمانوں کا گروہ ہے۔ اس وقت تک غیر مسلموں کی طرف سے ہمارے خلاف نہ کوئی آواز اٹھی ہے اور نہ عملاً کوئی مزاحمت و مخالفت ہوئی ہے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیندہ بھی یہی صورت حال رہے گی، نہ یہ اندازہ

کر سکتے ہیں کہ کب تک یہ صورت حال رہے گی، بہ ہر حال یہ واقعہ اپنی جگہ نہایت دردناک اور افسوس ناک ہے کہ اس دعوت کو سن کر ناک بھوں چڑھانے والے، اسے اپنے لیے خطرہ سمجھنے والے اور اس کی مزاحمت میں سب سے آگے بڑھ کر سعی کرنے والے غیر مسلم نہیں بل کہ مسلمان ہیں۔ شاید ایسی ہی کچھ صورت حال ہوگی جس میں اہل کتاب سے فرمایا گیا تھا وَلَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ۔ ہمیں ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں تک سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے مگر بہت کم ایسا اتفاق ہوا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے ہمارے لٹریچر کو پڑھ کر یا ہمارے مدعا کو تفصیل کے ساتھ ـــــ ہماری زبان سے سن کر یہ کہا ہو کہ یہ "حق" نہیں ہے، یا یہ کہ اگر تم اس چیز کو قائم کرنے کی کوشش کروگے تو ہم ایڑی سے چوٹی تک کا زور تمہاری مزاحمت میں لگادیں گے۔ متعدد غیر مسلم ہم کو ایسے بھی ملے ہیں جنھوں نے بے اختیار ہو کر کہا کہ کاش یہی اسلام ہندستان میں پیش کیا گیا ہوتا اور اسی کو قائم کرنے کے لیے باہر سے آنے والے اور اندر سے قبول کرنے والے مسلمانوں نے کوشش کی ہوتی تو آج ہندستان کا یہ نقشہ نہ ہوتا اور اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ بعض غیر مسلموں نے ہم سے یہاں تک کہا کہ اگر فی الواقع ایسی ایک سوسائٹی موجود ہو جو پوری دیانت کے ساتھ ان ہی اصولوں پر چلے اور جس کا مرنا اور جینا سب اسی ایک مقصد کے لیے ہو تو ہمیں اس کے اندر شامل ہونے میں کوئی تأمل نہ ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس ہماری مخالفت میں سرگرم اور ہمارے متعلق بدگمانیاں پھیلانے اور ہم پر ہر طرح کے الزام لگانے والے اگر کوئی گروہ سب سے پہلے اٹھا تو وہ مسلمانوں کا گروہ ہے اور ان میں بھی سب سے زیادہ یہ شرف مذہبی طبقے کے حضرات کو حاصل ہوا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ آج تک کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ جس چیز کی دعوت تم لوگ دیتے ہو وہ باطل ہے۔ شاید اس دعوت پر سامنے سے حملہ (Frontal Attack) ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے مجبوراً کبھی عقب سے اور کبھی دائیں پہلو سے اور کبھی بائیں جانب سے چھاپے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ بات تو حق ہے۔ مگر اس کی دعوت دینے والا ایسا اور ایسا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے حق ہونے میں تو کلام نہیں مگر اس زمانے میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ حق تو یہی ہے مگر اس کا علم بلند کرنے کے لیے صحابۂ کرام جیسے لوگ درکار ہیں اور وہ بھلا اب کہاں آسکتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کے صداقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر مسلمان اپنی موجودہ سیاسی و معاشی پوزیشن میں اس

دعوت کو اپنی واحد دعوت کیسے بنا سکتے ہیں۔ ایسا کریں تو ان کی دنیا تباہ ہو جائے اور تمام سیاسی اور معاشی زندگی پر غیر مسلم قابض ہو کر ان کے لیے سانس لینے تک کی جگہ نہ چھوڑیں۔ پھر جب اس مسلمان قوم میں سے کوئی اللہ کا بندہ ایسا نکل آتا ہے جو ہماری اس دعوت کو قبول کر کے اپنی زندگی کو واقعی نفاق و تناقض سے پاک کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی پوری زندگی کو بندگی رب میں دے ڈالنے کا تہیّہ کر لیتا ہے تو سب سے پہلے اس کی مخالفت کرنے کے لیے اس کے اپنے بھائی بند، اس کے ماں باپ، اعزہ اور اقرباء، برادری کے لوگ اور دوست آشنا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے متقی اور دین دار آدمی بھی جن کی پیشانیوں پر نمازیں پڑھتے پڑھتے گٹے پڑ چکے ہیں اور جن کی زبانیں مذہبیت کی باتوں سے ہر وقت تر رہتی ہیں اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا بیٹا یا بھائی یا کوئی عزیز جس کا دنیوی مفاد انہیں کسی درجے میں بھی محبوب ہو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالے۔

یہ بات کہ اس دعوت کی مخالفت سب سے پہلے مسلمانوں نے کی اور ان کے بھی اہل دنیا نے نہیں بل کہ اہل دین نے کی، ایک بہت بڑی بیماری کا پتہ دیتی ہے جو پرورش پا رہی تھی مگر ظاہر فریب پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ آج اگر ہم محض علمی رنگ میں اس دعوت کو پیش کرتے اور یہ نہ کہتے کہ آؤ اس چیز کو عمل میں لانے اور بالفعل قائم کرنے کی کوشش کریں تو آپ دیکھتے کہ مخالفت کے بجائے ان مزے دار علمی باتوں پر ہر طرف سے تحسین و آفرین ہی کی صدائیں بلند ہوتیں۔ بھلا کوئی مسلمان، ایسا بھی ہو سکتا ہے جو یہ کہہ سکے کہ بندگی خدا کے سوا کسی اور کی ہونی چاہیے، یا کہ مسلمان کو نفاق کی حالت میں اور منافی ایمان اعمال میں مبتلا رہنا چاہیے، یا یہ کہ زمام کار مسلمان کے ہاتھ میں نہیں بل کہ کفار ہی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے، یا شریعت الٰہی کو نہیں کفر ہی کے قوانین کو دنیا میں جاری رہنا چاہیے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک جن چیزوں کی ہم نے دعوت دی ہے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم دعوت عمل کے بغیر صرف علمی حیثیت سے پیش کرتے تو مسلمانوں میں سے کوئی گروہ بل کہ کوئی فرد اس کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ ہوتا لیکن جس چیز نے لوگوں کو مخالفت پر آمادہ کیا وہ صرف یہ ہے کہ ہم ان باتوں کو فقط علمی رنگ میں ہی نہیں پیش کرتے بل کہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ آؤ جس چیز کو از روئے حق جانتے ہو اسے عملاً پہلے اپنی زندگی میں اور پھر اپنے گرد و پیش دنیا کی زندگی میں قائم و

جاری کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بعینہ وہی صورت حال ہے جو اس سے پہلے نبی ﷺ کے ظہور کے وقت پیش آ چکی ہے۔ جو لوگ عرب جاہلیت کے لٹریچر پر نگاہ رکھتے ہیں ان سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے جس توحید کی دعوت دی تھی اور جن اصولِ اخلاق کو آپؐ پیش فرماتے تھے وہ عرب میں بالکل کوئی نئی چیز نہ تھے اسی قسم کے موحدانہ خیالات زمانہ جاہلیت کے متعدد شعراء اور خطیب پیش کر چکے تھے اور اسی طرح اسلامی اخلاقیات میں سے بھی بیش تر وہ تھے جن کو اہل عرب کے حکماء اور خطباء اور شعراء بیان کرتے رہے تھے۔ مگر فرق جو کچھ تھا وہ یہ کہ نبی ﷺ نے ایک طرف تو باطل کی آمیزشوں سے الگ کر کے خالص حق کو ایک مکمل و مرتب نظام زندگی کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا اور دوسری طرف آپؐ نے یہ بھی چاہا کہ جس توحید کو ہم حق کہتے ہیں اس کے مخالف عناصر کو ہم اپنی زندگی سے خارج کر دیں اور سارے نظام زندگی کو اسی توحید کی بنیاد پر تعمیر کریں۔ نیز یہ کہ جن اصول اخلاق کو ہم معیار تسلیم کرتے ہیں ہماری پوری زندگی کا نظام بھی ان ہی اصولوں پر عملاً قائم ہو۔ یہی سبب تھا کہ جن باتوں کے کہنے پر زمانہ جاہلیت کے کسی خطیب، کسی شاعر اور کسی حکیم کی مخالفت نہیں کی گئی بل کہ الٹا انہیں سراہا گیا انہی باتوں کو جب نبی ﷺ نے پیش کیا تو ہر طرف سے مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، کیوں کہ لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ شرک پر جو نظام زندگی قائم تھا اسے بالکل ادھیڑ کر از سر نو توحید کی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور اس طرح ان تعصبات اور آبائی رسموں کا، امتیازات اور ''حقوق'' اور مناصب کا اور اعزازات و کرامات اور معاشی مفادات کا یک لخت خاتمہ ہو جائے جو صدہا برس سے عہد جاہلیت میں زندگی کی بنیاد بنے ہوئے تھے اور جن سے بعض طبقوں اور خاندانوں کی اغراض وابستہ تھیں۔ اسی طرح لوگ اس بات کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ اخلاق فاسدہ کے رواج سے جو آسائشیں اور لذتیں اور منفعتیں اور آزادیاں ان کو حاصل ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں اور اخلاق صالحہ کی بندشوں میں اپنے آپ کو خود کسوالیں۔ یہ معاملہ صرف نبی ﷺ ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا بل کہ حضورؐ سے پہلے جتنے نبی گزرے ہیں ان کی مخالفت بھی زیادہ تر اسی مسئلے پر ہوئی ہے۔ اگر انبیاء صرف علمی اور ادبی حیثیت سے توحید اور آخرت اور اخلاق فاضلہ کا ذکر کرتے تو ان کے زمانے کی سوسائٹیاں اسی طرح ان کو برداشت کرتیں بل کہ سر آنکھوں پر بٹھاتیں جس طرح انہوں نے مختلف قسم کے شاعروں اور فلسفیوں اور ادیبوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لیکن ہر نبی کا

مطالبہ ان باتوں کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیعُونِ (اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) اور لَا تُطِیعُوا اَمرَ المُسرِفِینَ۔ (حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو) اِتَّبِعُوا مَا اُنزِلَ عَلَیکُم مِّن رَّبِّکُم وَلَاتَتَّبِعُوا مِن دُونِہٖ اَولِیَآءَ (جو ہدایت تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو) اور پھر انبیاء نے اس پر بھی اکتفانہ کیا بل کہ ایک مستقل تحریک اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے جاری کی اور اپنے پیروؤں کے جتھے منظم کر کے عملاً نظام تہذیب اور تمدن اور اخلاق کو اپنے نصب العین کے مطابق بدل ڈالنے کی جدوجہد شروع کردی۔ بس یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے ان لوگوں کی مخالفت کا آغاز ہوا جن کے مفاد نظام جاہلیت سے کلی یا جزئی طور پر وابستہ تھے، اور آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ٹھیک یہی نقطہ ہے جہاں سے ہماری مخالفت کی ابتداء ہوئی ہے۔

مسلمانوں نے ایک طویل مدت سے اپنی پوری زندگی کی عمارت ان بہت سی مصالحتوں (Compromises) پر قائم کر رکھی ہے جو نظام جاہلیت کے اور ان کے درمیان طے ہو چکے ہیں۔ یہ مصالحتیں صرف دنیادارانہ ہی نہیں ہیں بل کہ انہوں نے اچھی خاصی مذہبی نوعیت بھی اختیار کر لی ہے۔ بڑے بڑے مقدس لوگ جن کے تقدس کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں، ان مصالحتوں میں پھنسے ہوے ہیں۔ نظام باطل کی وابستگی کے ساتھ تقویٰ اور عبادت کے چند مظاہر اس قدر کافی قرار دیے جاچکے ہیں کہ بہ کثرت لوگ ان ہی پرہیز گاریوں اور عبادت گزاریوں پر اپنی نجات کی طرف سے مطمئن بیٹھے ہوے ہیں۔ بہت سے ارباب فضل اور اصحاب مقامات عالیہ ایسے موجود ہیں جن کی بزرگی اور روحانیت، اور جن کے اونچے مراتب، نظام جاہلیت کے ساتھ مصالحت کر لینے کے باوجود قائم ہیں۔ زبان سے کفر و جاہلیت اور فسق و فجور اور بداعتقادیوں اور ضلالتوں کی مذمت کر لینا اور عہد صحابہ کے نقشے بڑی طلاقت لسانی کے ساتھ اپنے وعظوں اور اپنی تحریروں میں کھینچ دینا اسلام کا حق ادا کرنے کے لیے بالکل کافی ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد ان حضرات کے لیے بالکل حلال ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اور اپنے متعلقین اور اپنے پیروؤں کو اسی نظام باطل کی خدمت میں لگادیں جس کے لائے ہوے سیلاب ضلالت وگم راہی اور طوفان فسق و فجور کی یہ دن رات مذمت کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں جب ہم دین حق اور اس کے مطالبات اور مقتضیات کو محض علمی حیثیت ہی سے پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بل کہ یہ دعوت

بھی دیتے ہیں کہ غلط نظام کے ساتھ وہ تمام مصالحتیں ختم کر دو جو تم نے کر رکھی ہیں اور کامل یکسوئی و یک رنگی کے ساتھ حق کی پیروی اختیار کرو اور پھر اس باطل کی جگہ اس حق کو قائم کرنے کے لیے جان و مال اور وقت و محنت کی قربانی دو جس پر تم ایمان لائے ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ قصور ایسا نہیں ہے جسے معاف کیا جا سکے۔ اگر سیدھی طرح یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقعی دین کے مطالبات اور مقتضیات یہی ہیں اور حقیقت میں حنیفیت اسی کو کہتے ہیں اور اصل بات یہی ہے کہ نظام باطل کے ساتھ مومن کا تعلق مصالحت کا نہیں بل کہ نزاع و کش مکش کا ہونا چاہیے، تو پھر دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یا تو اپنے مفاد کی قربانی گوارا کر کے اس جدوجہد میں حصہ لیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بہت جاں گسل بات ہے، یا پھر اعتراف کر لیا جائے کہ حق تو یہی ہے مگر ہم اپنی کم زوری کی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ اعتراف بھی مشکل ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے صرف یہی نہیں کہ نجات کی وہ گارنٹی خطرے میں پڑ جاتی ہے جس کے اطمینان پر اب تک زندگی بسر کی جارہی تھی بل کہ اس طرح وہ مقام تقدس بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے جو مذہبی و روحانی حیثیت سے ان حضرات کو حاصل رہا ہے اور یہ چیز بھی بہ ہر حال ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ایک بڑے گروہ نے مجبوراً یہ تیسری راہ اختیار کی ہے کہ صاف صاف ہماری اس دعوت کو باطل تو نہ کہا جائے کیوں کہ باطل کہنے کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے، لیکن صاف صاف اس کے حق ہونے کا بھی اعتراف نہ کیا جاے اور اگر کہیں اس کی حقانیت کا اقرار کرنا پڑ ہی جاے تو پھر اصول کو چھوڑ کر کسی شخص یا اشخاص کو بدگمانیوں اور الزامات کا ہدف بنایا جاے تا کہ خود اپنے ہی مانے ہوے حق کا ساتھ نہ دینے کے لیے وجہ جواز پیدا ہو جاے۔ کاش یہ حضرات کبھی اس بات پر غور فرماتے کہ جو حجتیں آج بندوں کا منہ بند کرنے کے لیے وہ پیش کرتے ہیں کل قیامت کے روز کیا وہ خدا کا منہ بھی بند کر دیں گی۔

ہمارا طریق کار

اب میں آپ کے سامنے مختصر طور پر اس ''طریق کار'' کو پیش کروں گا جو ہم نے اپنی اس دعوت کے لیے اختیار کیا ہے۔ ہماری دعوت کی طرح ہمارا یہ طریق کار بھی دراصل قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے سے ماخوذ ہے۔ جو لوگ ہماری دعوت کو قبول کرتے ہیں ان سے ہمارا

اولین مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو عملاً اور بالکلیہ بندگی رب میں دے دو اور اپنے عمل سے اپنے اخلاص اور اپنی یکسوئی کا ثبوت دو اور ان تمام چیزوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنے کی کوشش کرو جو تمہارے ایمان کی ضد ہیں۔ یہیں سے ان کے اخلاق و سیرت کی تعمیر اور ان کی آزمایش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے بڑی بڑی امنگوں (Ambitions) کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی انہیں اپنے اونچے اونچے خوابوں کی عمارتیں اپنے ہاتھ سے ڈھا دینی پڑتی ہیں اور اس زندگی میں قدم رکھنا پڑتا ہے جس میں جاہ و منصب اور معاشی خوش حالیوں کے امکانات انہیں اپنی زندگی میں تو درکنار اپنی دوسری تیسری پشت میں بھی دور دور نظر نہیں آتے۔ جن لوگوں کی معاشی خوش حالی کسی مرہونہ زمین یا کسی مغصوبہ جائداد یا کسی ایسی میراث پر قائم تھی جس میں حق داروں کے حقوق مارے گئے تھے انہیں بسا اوقات دامن جھاڑ کر اس خوش حالی سے کنارہ کش ہو جانا پڑتا ہے، صرف اس لیے کہ جس خدا کو انہوں نے اپنا آقا تسلیم کیا ہے اس کے منشاء کے خلاف کسی مال کا کھانا ان کے ایمان کے منافی ہے۔ جن لوگوں کے وسائل زندگی غیر شرعی تھے یا نظام باطل سے وابستہ تھے ان کو ترقیوں کے خواب دیکھنا تو درکنار موجودہ وسائل سے حاصل کی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی حلق سے اتارنا ناگوار ہونے لگتا ہے اور وہ ان وسائل کو پاک تر وسائل سے خواہ وہ حقیر ترین ہی کیوں نہ ہوں، بدلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔ پھر جیسا کہ ابھی میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں، اس مسلک کو عملاً اختیار کرتے ہی آدمی کا قریب ترین ماحول اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس کے اپنے والدین، اس کے بھائی بند، اس کی بیوی اور بچے اور اس کے جگری دوست سب سے پہلے اس کے ایمان کے ساتھ قوت آزمائی شروع کر دیتے ہیں اور بسا اوقات اس مسلک کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی آدمی کا اپنا گہوارہ جس میں وہ نازوں سے پالا گیا تھا اس کے لیے زنبور خانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ ابتدائی تربیت گاہ جو صالح و مخلص اور قابل اعتماد سیرت کے کارکن فراہم کرنے کے لیے قدرت الٰہی نے ہمارے لیے خود بہ خود پیدا کر دی ہے۔ ان ابتدائی آزمایشوں میں جو لوگ ناکام ہو جاتے ہیں وہ آپ سے آپ چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان کو چھانٹ پھینکنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی اور جو لوگ ان میں پورے اترتے ہیں وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کے اندر کم از کم اتنا اخلاص، اتنی یکسوئی، اتنا صبر اور عزم، اتنی محبتِ حق اور اتنی مضبوطی سیرت ضرور موجود ہے جو خدا کی راہ میں قدم رکھنے اور پہلے مرحلہ

امتحان سے کام یاب گزر جانے کے لیے ضروری ہے۔ اس مرحلے کے کام یاب لوگوں کو ہم نسبتاً زیادہ بھروسے اور اطمینان کے ساتھ لے کر دوسرے مرحلے کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں جو آگے آنے والا ہے اور جس میں اس سے زیادہ آزمایشیں پیش آنے والی ہیں۔ وہ آزمایشیں پھر ایک دوسری بھٹی تیار کریں گی جو اسی طرح کھوٹے سکوں کو چھانٹ کر پھینک دے گی اور زرِ خالص کو اپنی گود میں رکھ لے گی۔ جہاں تک ہمارا علم ساتھ دیتا ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی معادن سے کارآمد عناصر کو چھانٹنے اور زیادہ کارآمد بنانے کے لیے یہی طریقہ پہلے بھی اختیار کیا جاتا رہا ہے اور جو تقویٰ ان بھٹیوں میں تیار ہوتا ہے، چاہے وہ فقہی ناپ تول میں پورا نہ اترے، اور خانقاہی معیاروں پر بھی ناقص نکلے، مگر صرف اسی طرز سے تیار کیے ہوئے تقوے میں یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ انتظامِ دنیا کی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھال سکے اور ان عظیم الشان امانتوں کا بار اٹھا سکے جن کے ایک قلیل سے قلیل جز کا وزن بھی خانقاہی تقویٰ کی برداشت سے باہر ہے۔

اس کے ساتھ دوسری چیز جو ہم اپنے ارکان پر لازم کرتے ہیں یہ ہے کہ جس حق کی روشنی انھوں نے پائی ہے اس سے وہ اپنے قریبی ماحول کو اور ان سب لوگوں کو جن سے ان کا قرابت یا دوستی یا ہم سائیگی یا لین دین کا تعلق ہے، روشناس کرانے کی کوشش کریں اور انہیں اس کی طرف آنے کی دعوت دیں۔ یہاں پھر آزمایشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس تبلیغ کی وجہ سے مبلغ کی اپنی زندگی درست ہوتی ہے کیوں کہ یہ کام شروع کرتے ہی بے شمار خوردبین اور رویدبان (Search Light) اس کی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور مبلغ کی زندگی میں اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے ایمان اور اس کی دعوت کے منافی موجود ہو تو یہ مفت کے محتسب اسے نمایاں کر کے مبلغ کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور تازیانے لگا لگا کر اسے مجبور کرتے ہیں کہ اپنی زندگی کو اس سے پاک کرے۔ اگر مبلغ فی الواقع اس دعوت پر سچے دل سے ایمان لایا ہو تو وہ ان تنقیدوں پر جھنجھلانے اور تاویلوں سے اپنے عمل کی غلطی کو چھپانے کی کوشش نہ کرے گا بل کہ ان لوگوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گا جو مخالفت کی نیت ہی سے سہی مگر بہ ہر حال اس کی اصلاح میں بغیر کسی معاوضے کی سعی و محنت کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس برتن کو بیسیوں ہاتھ مانجھنے میں لگ جائیں اور مانجھتے ہی چلے جائیں وہ چاہے کتنا ہی کثیف ہو آخر کار مجلّا و مصفا ہو کر رہے گا۔

پھر اس تبلیغ سے ہمارے کارکنوں میں بہت سے ان اوصاف کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے جنہیں آگے چل کر دوسرے میدانوں میں کسی اور شکل سے ہم کو استعمال کرنا ہے۔ جب مبلغ کو طرح طرح کے دل شکن حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہیں اس کی ہنسی اڑائی جاتی ہے، کہیں اس پر طعنے اور آوازے کسے جاتے ہیں، کہیں گالیوں اور دوسری جہالتوں سے اس کی تواضع کی جاتی ہے، کہیں اس پر الزامات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے، کہیں اس کو فتنوں میں الجھانے کی نت نئی تدبیریں کی جاتی ہیں، کہیں اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے، میراث سے محروم کیا جاتا ہے، دوستیاں اور رشتہ داریاں اس سے منقطع کر لی جاتی ہیں اور اس کے لیے اپنے ماحول میں سانس تک لینا دشوار کر دیا جاتا ہے، تو ان حالات میں جو کارکن نہ ہمت ہارے، نہ حق سے پھرے، نہ باطل پرستوں کے آگے سپر ڈالے، نہ مشتعل ہو کر اپنے دماغ کا توازن کھوئے، بل کہ اس کے برعکس حکمت اور تدبر اور ثابت قدمی اور راست بازی اور پرہیز گاری اور ایک سچے حق پرست کی سی ہم دردی و خیر خواہی کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم اور اپنے ماحول کی اصلاح میں پیہم کوشاں رہے، اس کے اندر اوصاف عالیہ کا پیدا ہونا اور نشو و نما پانا یقینی ہے جو آگے چل کر ہماری اس جدوجہد کے دوسرے مرحلوں میں اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر درکار ہوں گے۔

اس تبلیغ کے سلسلے میں ہم نے وہی طریق کار اپنے کارکنوں کو سکھانے کی کوشش کی ہے جو قرآن مجید میں تعلیم فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ خدا کے راستے کی طرف دعوت دیں، تدریج اور فطری ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں کے سامنے دین کے اولین بنیادی اصولوں کو پھر رفتہ رفتہ ان کے مقتضیات اور لوازم کو پیش کریں، کسی کو اس کی قوت ہضم سے بڑھ کر خوراک دینے کی کوشش نہ کریں، فروع کو اصول پر اور جزئیات کو کلیات پر مقدم نہ کریں، بنیادی خرابیوں کو رفع کیے بغیر ظاہری برائیوں اور بیرونی شاخوں کو چھانٹنے اور کاٹنے میں اپنا وقت ضایع نہ کریں، غفلت اور اعتقادی و عملی گم راہیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے ساتھ نفرت و کراہیت کا برتاؤ کرنے کے بجائے ایک طبیب کی سی ہم دردی و خیر خواہی کے ساتھ ان کے علاج کی فکر کریں، گالیوں اور پتھروں کے جواب میں دعائے خیر کرنا سیکھیں، ظلم اور ایذا رسانی پر صبر کریں، جاہلوں سے بحثوں اور مناظروں اور نفسانی مجادلوں میں نہ الجھیں، لغو اور بے ہودہ باتوں سے عالی ظرف اور شریف لوگوں کی طرح درگزر کریں، جو لوگ حق سے مستغنی بنے ہوئے ہوں

ان کے پیچھے پڑنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف توجہ کریں جن کے اندر کچھ طلب حق پائی جاتی ہو خواہ وہ دنیوی اعتبار سے کتنے ہی ناقابل توجہ سمجھے جاتے ہوں، اور اپنی اس تمام سعی و جہد میں ریا اور نمود و نمایش سے بچیں، اپنے کارناموں کو گنانے اور فخر کے ساتھ ان کا مظاہرہ کرنے اور لوگوں کی توجہات اپنی طرف کھینچنے کی ذرہ برابر کوشش نہ کریں، بل کہ جو کچھ کریں اس نیت اور اس یقین و اطمینان کے ساتھ کریں کہ ان کا سارا عمل خدا کے لیے ہے اور خدا بہ ہر حال ان خدمات سے بھی واقف ہے اور ان کی خدمات کی قدر بھی اسی کے ہاں ہونی ہے خواہ خلق اس سے واقف ہو یا نہ ہو اور خلق کی طرف سے سزا ملے یا جزا۔ یہ طریق کار غیر معمولی صبر اور حلم اور محنت چاہتا ہے۔ اس میں ایک مدت دراز تک مسلسل کام کرنے کے بعد بھی نتائج کی وہ ہری بھری فصل لہلہاتی نظر نہیں آتی جو سطحی اور نمایشی کام شروع کرتے ہی دوسرے دن سے برائیوں اور مداریوں کا دل لبھانا شروع کر دیتی ہے۔ اس میں ایک طرف خود کارکن کے اندر وہ گہری بصیرت، وہ سنجیدگی، وہ پختہ کاری اور معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک کے زیادہ صبر آزما اور زیادہ محنت و حکمت چاہنے والے مراحل میں درکار ہونے والی ہے، اور دوسری طرف اس سے تحریک اگرچہ آہستہ رفتار سے چلتی ہے مگر اس کا ایک ایک قدم مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف ایسے ہی طریق تبلیغ سے سوسائٹی کا مکھن نکال کر تحریک میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ اوچھے اور سطحی لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے کے بجائے اس طریق تبلیغ سے سوسائٹی کے صالح ترین عناصر تحریک کی طرف کھنچتے ہیں اور وہ سنجیدہ (Serious) کارکن تحریک کو میسر آتے ہیں جن میں سے ایک ایک آدمی کی شرکت ہزار بوالفضولوں کے انبوہ سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

ہمارے طریق کار کا ایک بڑا اہم جز یہ ہے کہ ہم نے آپ کو نظام باطل کی قانونی اور عدالتی حفاظت سے خود بہ خود محروم کر لیا ہے اور علی الاعلان دنیا کو بتا دیا ہے کہ ہم اپنے انسانی حقوق، اپنے مال و جان اور عزت و آبرو، کسی چیز کی عصمت بھی قائم رکھنے کے لیے اس نظام زندگی کی مدد حاصل کرنا نہیں چاہتے جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس چیز کو ہم نے تمام ارکان پر لازم نہیں کیا ہے بل کہ ان کے سامنے ایک بلند معیار رکھ دینے کے بعد ان کو اختیار دے دیا ہے کہ چاہیں تو اس معیار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جائیں ورنہ حالات کی مجبوریوں سے شکست کھا کھا کر جس قدر پستی میں گرنا چاہیں گرتے چلے جائیں۔ البتہ پستی کی ایک حد ہم نے مقرر کر دی ہے

کہ اس حد تک گر جانے والے کو ہم اپنی جماعت میں نہ رکھیں گے، یعنی ایسا شخص جو جھوٹا مقدمہ بنائے، یا جھوٹی شہادت دے، یا ایسی مقدمہ بازی میں الجھے جس کے لیے کسی مجبوری کا عذر پیش نہ کیا جاسکے بل کہ وہ سراسر منفعت طلبی یا نفسانیت کی تسکین یا دوستی اور رشتہ داری کی عصبیت ہی پر مبنی ہو، ہماری جماعت میں جگہ نہیں پاسکتا۔

بظاہر لوگ ہمارے اس طریق کار کی حکمتوں کو جو ہم نے قانون وعدالت کے معاملے میں اختیار کیا ہے پوری طرح نہیں سمجھتے اس لیے وہ طرح طرح کے سوالات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس کے بے شمار فائدے ہیں۔ اس کا اولین فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنا ایک بااصول جماعت ہونا اپنے عمل سے اور ایسے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں جو محض تفریحی نوعیت ہی نہیں رکھتا بل کہ صریح طور پر نہایت تلخ اور انتہائی کڑی آزمائشیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کو انسانی زندگی کے لیے قانون بنانے کا حق نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کا حق ہے اور خدا کی اطاعت اور اس کے قانون کی پابندی کے بغیر کوئی زمین میں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے، اور جب ہمارا یہ عقیدہ کہ جو قانون الٰہی کی سند کے بغیر معاملات انسانی کا فیصلہ کرے وہ کافر اور فاسق اور ظالم ہے تو ہمارے اس عقیدے اور ہمارے اس دعوے سے خود بہ خود یہ بات لازم آجاتی ہے کہ ہم اپنے حقوق کی بنیاد کسی غیر الٰہی قانون پر نہ رکھیں اور حق اور غیر حق کا فیصلہ کسی ایسے حاکم کی حکومت پر نہ چھوڑیں جس کو ہم باطل سمجھتے ہیں۔ اپنے عقیدے کے اس تقاضے کو اگر ہم سخت نقصانات اور انتہائی خطرات کے مقابلے میں بھی پورا کر کے دکھادیں تو یہ ہماری راستی اور ہماری مضبوطیِ سیرت اور ہمارے عقیدے اور عمل کی مطابقت کا ایسا بین ثبوت ہوگا جس سے بڑھ کر کسی دوسرے ثبوت کی حاجت نہیں رہتی۔ اور اگر کسی نفع کی امید یا کسی نقصان کا خطرہ یا ظلم وستم کی چوٹ ہم کو مجبور کردے کہ ہم اپنے عقیدے کے خلاف کام کر گزریں تو یہ ہماری کم زوری کا اور ہماری سیرت کے بودے پن کا ایک نمایاں ترین ثبوت ہوگا جس کے بعد کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت نہ رہے گی۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اپنے ارکان کی پختگی اور ان کے قابل اعتماد یا ناقابل اعتماد ہونے کا اندازہ کرنے کے لیے ہمارے پاس یہ ایک ایسی کسوٹی ہوگی جس سے ہم بہ آسانی یہ

معلوم کرتے رہیں گے کہ ہم میں سے کون لوگ کتنے پختہ ہیں اور کس سے کس قسم کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس کا تیسرا اور عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ ہمارے ارکان یہ مسلک اختیار کرنے کے بعد آپ سے آپ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ سوسائٹی کے ساتھ اپنے تعلقات کو قانون کی بنیادوں پر قائم کرنے کے بہ جائے اخلاق کی بنیادوں پر قائم کریں۔ ان کو اپنا اخلاقی معیار اتنا بلند کرنا پڑے گا، اپنے آپ کو اپنے ماحول میں اس قدر راست باز اتنا متدین، اتنا خدا ترس اور اس قدر خیر مجسم بنانا پڑے گا کہ لوگ خود بہ خود ان کے حقوق، اور ان کی عزت اور ان کے جان و مال کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ کیوں کہ اس اخلاقی تحفظ کے سوا ان کے لیے دنیا میں اور کوئی تحفظ نہ ہوگا اور قانونی تحفظ سے محروم ہونے اور پھر اخلاقی تحفظ بھی حاصل نہ کرنے کی صورت میں ان کی حیثیت دنیا میں بالکل ایسی ہو کر رہ جائے گی جیسے جنگل میں ایک بکری بھیڑیوں کے درمیان رہتی ہو۔

اس کا چوتھا فائدہ یہ ہے اور یہ بھی کچھ اہم نہیں ہے کہ ہم اس طرح اپنے آپ کو اور اپنے مفاد اور حقوق کو خطرے میں ڈال کر موجودہ سوسائٹی کی اخلاقی حالت کو بالکل برہنہ کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیں گے۔ جب لوگ یہ جاننے کے بعد کہ ہم پولیس اور عدالت سے اپنی حفاظت کے لیے کوئی مدد لینے والے نہیں ہیں، ہمارے حقوق پر علی الاعلان ڈاکے ماریں گے تو یہ اس بات کا نمایاں ترین ثبوت ہوگا کہ ہمارے ملک کی اور ہماری سوسائٹی کی اخلاقی حالت کس قدر کھوکھلی ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو صرف اس وجہ سے شریف بنے ہوئے ہیں کہ قانون نے ان کو شریف بنا رہنے پر مجبور کر رکھا ہے، کتنے آدمی ہیں جو ہر قسم کی خیانت اور بے ایمانی کرنے پر آمادہ ہو سکتے بشرطیکہ ان کو اطمینان ہو جائے کہ دنیا میں کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہیں ہے، کتنے آدمی ہیں جنہوں نے مذہب اور اخلاق اور انسانیت کے جھوٹے لبادے اوڑھ رکھے ہیں حالاں کہ اگر موقع میسر آ جائے اور کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو تو ان سے بدترین بداخلاقی اور لامذہبیت اور حیوانیت کا صدور نہایت آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہ اخلاقی ناسور جو چھپا ہوا ہے اور اندر ہی اندر ہماری قومی سیرت کو گلا اور سڑا رہا ہے ہم اس کو علیٰ رؤس الاشہاد بے پردہ کر کے رکھ دیں گے تاکہ ہمارے ملک کا اجتماعی ضمیر چونک پڑے اور اسے ٹھیک اندازہ ہو کہ جس مرض سے وہ اب تک غفلت برت رہا ہے وہ کتنی دور پہنچ چکا ہے۔

صاحبو! اپنی دعوت اور اپنے طریق کار کی یہ مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے پیش کردی ہے۔ آپ اس کو جانچیں اور پرکھیں اور اس پر کڑی سے کڑی تنقید کریں اور دیکھیں کہ ہم کسی چیز کی طرف بلا رہے ہیں، اور بلانے کے لیے ہم نے جو ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، کس حد تک خدا اور رسول کی تعلیمات کے مطابق ہے، کس حد تک موجودہ انفرادی و اجتماعی امراض کا صحیح علاج ہے، اور کس حد تک اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود یعنی کلمۃ اللہ کے بلند اور کلمات باطلہ کے پست ہوجانے کو حاصل کرسکتے ہیں۔ اب میں ان شبہات و اعتراضات پر کچھ عرض کروں گا جو اسی اجتماع کے دوران میں بعض رفقاء اور ہمدردوں کے ذریعے سے مجھ تک پہنچائے گئے ہیں۔

علماء اور مشائخ کی آڑ

ایک اعتراض جو پہلے بھی بار بار سن چکا ہوں اور آج بھی وہ میرے پاس تحریری شکل میں آیا ہے، یہ ہے کہ ایسے ایسے بڑے بڑے علماء اور پیشوایان دین (جن کے کچھ نام بھی گنائے گئے ہیں) کیا دین سے اس قدر ناواقف تھے کہ نہ صرف یہ کہ خود انہوں نے دین کے ان تقاضوں کو جو تم بیان کرتے ہو نہیں سمجھا اور پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی بل کہ تمہارے بیان کرنے کے بعد بھی انہوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور نہ تمہارے ساتھ تعاون کرنا قبول کیا؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سب دین سے ناواقف ہیں؟ یا اس بات کا کہ تم نے خود دین کے نام سے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جو مقتضیات دین میں سے نہیں ہے؟ اس سوال کا بہت مختصر جواب میرے پاس یہ ہے کہ میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بہ جائے ہمیشہ قرآن اور سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں بل کہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسول نے کیا کیا؟ اسی ذریعہ معلومات کی طرف میں آپ لوگوں کو بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ یہ دیکھیے کہ جس چیز کی طرف میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں اور جو طریق کار اس کے لیے پیش کر رہا ہوں آیا قرآن کی دعوت وہی ہے اور انبیاء علیہم السلام کا طریق کار وہی رہا ہے یا نہیں۔ اگر قرآن و سنت سے یہ

بات ثابت ہو جائے اور آپ کے نزدیک قرآن وسنت ہی اصل ذریعۂ ہدایت ہوں، تو میری بات مانئے اور میرے ساتھ آجایئے اور اگر اس دعوت اور طریق کار میں کوئی چیز قرآن وسنت سے ہٹی ہوئی ہو تو بے تکلف اسے ظاہر کردیجیے۔ جس وقت مجھ پر اور میرے رفقاء پر یہ منکشف ہوجائے گا کہ ہم کہیں بال برابر بھی قرآن اور سنت سے ہٹے ہیں تو آپ ان شاء اللہ دیکھ لیں گے کہ ہم حق کی طرف رجوع کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ حق و باطل کا فیصلہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے بہ جائے اشخاص پر رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو پورا اختیار ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل کو اشخاص ہی کے حوالے کر دیجیے اور خدا کے ہاں بھی یہی جواب دیجیے گا کہ ہم نے اپنا دین تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کے بہ جائے فلاں اور فلاں لوگوں کے حوالے کردیا تھا۔ یہ جواب دہی اگر آپ کو خدا کے ہاں نجات دیتی ہے تو اسی پر اطمینان سے کام کرتے رہیے۔

زہد کا طعنہ

ایک اور اعتراض جس کے متعلق مجھے لکھا گیا ہے کہ ایک مخلص ہمدرد نے اسے پیش کیا ہے یہ ہے کہ ”تمہاری جماعت محض چند زہاد اور تارکین دنیا کی ایک جماعت ہے جو دنیا کے معاملات سے بے تعلق ہو کر ایک طرف مڑ گئی ہے اور جسے سیاسیات حاضرہ سے کوئی بحث نہیں ہے، اور درآنحالے کہ مسلمانوں کو حالات نے مجبور کردیا ہے کہ بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ان مسائل سیاسی کو حل کریں جن کے حل پر پوری قوم کے مستقبل کا انحصار ہے اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی مجبور ہیں کہ سب سے پہلے اپنے ملک کے سیاسی مستقبل کی فکر کریں کیوں کہ اسی پر ان کی فلاح کا مدار ہے۔ لہٰذا اس ملک میں جو لوگ بھی زندگی کے عملی مسائل سے دل چسپی و تعلق رکھتے ہیں وہ تو تمہاری طرف توجہ نہیں کر سکتے البتہ کچھ گوشہ نشین وزاویہ پسند لوگ جو مذہبی ذہنیت رکھتے ہوں تمہیں ضرور مل جائیں گے۔“ یہ اعتراض دراصل اس سطح بینی کا نتیجہ ہے جس سے ہمارے آج کل کے سیاست کار حضرات معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے میں کام لے رہے ہیں۔ یہ لوگ محض سیاسی اشکال اور صورتوں کے ردوبدل کو دیکھتے ہیں اور انھیں میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں لیکن سیاست کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہوتی ہے ان تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی۔

آپ کے موجودہ سیاسی مسائل جن کی فکر میں آپ لوگ آج کل الجھے ہوئے ہیں کس چیز کے پیدا شدہ ہیں؟ صرف اس چیز کے کہ جن اخلاقی اور اعتقادی وفکری اور تہذیبی وتمدنی بنیادوں پر اس ملک کی سوسائٹی قائم تھی وہ اتنی کمزور ثابت ہوئیں کہ ایک دوسری قوم اگر چہ وہ نہایت ہی گمراہ اور نہایت ہی غلط کار تھی مگر بہ ہر حال اپنے اخلاقی اوصاف، اپنی تہذیبی وتمدنی طاقت اور اپنی عملی قابلیتوں کے لحاظ سے وہ آپ سے اتنی زیادہ برتر ثابت ہوئی کہ ہزاروں میل دور سے آکر اس نے آپ کو اپنا محکوم بنالیا۔ پھر آپ اپنی مدت ہائے دراز کی غفلتوں اور کمزوریوں کی وجہ سے اس حدتک گرے کہ خود اس محکومی کے اندر بھی آپ کی ہم سایہ قومیں آپ کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوگئیں اور آپ کے لیے یہ سوال پیدا ہوگیا کہ اپنے آپ کو پہلے کس سے بچائیں، گھر والے سے یا باہر والے سے؟ یہ ہے آپ کے تمام موجودہ سیاسی مسائل کا خلاصہ، اور ان مسائل کو آپ بھی اور آپ کی ہم سایہ دوسری ہندستانی قومیں بھی صرف اس طرح حل کرنا چاہتی ہیں کہ ملک کا سیاسی نظام جس شکل پر قائم ہے اس میں بس کچھ اوپری ردوبدل ہوجائے۔ میں اس سیاست کو اور اس سیاسی طریق کار کو بالکل مہمل سمجھتا ہوں اور اس میں اپنا وقت ضائع کرنے کا کچھ حاصل نہیں پاتا۔ پھر صرف ہندستان ہی میں نہیں بل کہ ساری دنیا میں جو سیاسی مسائل اس وقت درپیش ہیں ان کا خلاصہ بھی میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان کو جو حیثیت دنیا میں فی الواقع حاصل نہیں تھی اسے خواہ مخواہ اپنی حیثیت بنالینے پر اس نے اصرار کیا اور اپنے اخلاق، اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنی معیشت اور اپنی سیاست کی بنیاد خدا سے خودمختاری پر رکھ دی جس کا انجام آج ایک عظیم الشان فساد اور ایک زبردست طوفان فسق وفجور کی شکل میں رونما ہورہا ہے۔ اس انجام کو انتظام دنیا کی محض ظاہری شکلوں کے ردوبدل سے دور کرنے کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں انھی کا نام آج ”سیاست“ ہے، اور میرے نزدیک فی الحقیقت اسلام کے نزدیک یہ ساری سیاست سراسر لغو اور بے اصل ہے۔ میں نے اسلام سے جن حقیقتوں کو سمجھا ہے ان کی بنا پر میرے نزدیک ہندستان کے مسلمانوں کی اور ہندستان کے سارے باشندوں کی اور تمام دنیائے مسلمین اور دنیائے غیر مسلمین کی سیاست کا حل صرف یہ ہے کہ ہم سب خدا کی بندگی اختیار کریں، اس کے قانون کو اپنا قانون حیات تسلیم کریں اور انتظام دنیا کی زمام اختیار فساق وفجار کے بجائے عباداللہ الصالحین کے ہاتھ میں ہو۔ یہ سیاست اگر آپ کو اپیل نہیں کرتی اور آپ کچھ دوسری سیاست بازیوں سے اپنے

مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا راستہ الگ ہے اور میرا راستہ الگ۔ جائیے اور جن جن طریقوں سے اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں حل کر کے دیکھ لیجیے۔ مگر میں اور میرے رفقاء علی وجہ البصیرت جس چیز میں اپنی قوم کی، اپنے ملک کی اور ساری دنیا کی فلاح دیکھتے ہیں اسی پر ہم اپنی ساری کوششیں صرف کرتے رہیں گے۔ اگر دنیا کے لوگ ہماری باتوں کی طرف توجہ کریں گے تو ان کے اپنے لیے بھلا ہے اور نہ کریں گے تو اپنا کچھ بگاڑیں گے ہمارا کچھ نقصان نہ کر سکیں گے۔

رہی یہ غلط فہمی کہ ہم زاہدوں اور گوشہ نشینوں کا ایک گروہ بنا رہے ہیں تو اگر یہ عمداً واقعہ کی غلط تعبیر نہیں ہے اور واقعی غلط فہمی ہے تو اسے ہم صاف صاف رفع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو، اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیا داروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے نا آشنا ہونے کی بنا پر گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور پرہیزگار اس کو سمجھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات ہی سے پرہیز کریں، اور دوسری طرف ساری دنیا کے کاروبار بدوں کے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر کبھی آتا بھی ہے تو صرف خلق خدا کو دھوکا دینے کے لیے۔ اس خرابی کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے آراستہ بھی ہو، اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیا داروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیا داری ہی میں اپنی مہارت و قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک صالح گروہ کو منظم کر لیا جائے۔ بد اخلاق اور بے اصول لوگوں کے لیے دنیا کی چراگاہ میں بس اسی وقت تک چرنے چگنے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا، اور جب ایسا گروہ تیار ہو جائے گا تو آپ یقین رکھیے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی بل کہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست اور معیشت اور مالیات اور علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اسی گروہ کے ہاتھ میں آجائیں گی اور فساق و فجار کا چراغ ان کے آگے نہ جل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوگا؟ لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ یہ

انقلاب بہ ہر حال رونما ہو کر رہے گا بشرطے کہ ہمیں صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔

رفقائے جماعت سے خطاب

اب میں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا کہ تھوڑی دیر کے لیے عام خطاب کو چھوڑ کر خاص طور پر کچھ باتیں اپنے رفقاء سے عرض کروں۔

رفقائے محترم! سب سے پہلے آپ سے خطاب کرتے ہوئے میں اسی بات کو دہرانا ضروری سمجھتا ہوں جسے ہمیشہ ہر اجتماع کے موقع پر دہراتا رہا ہوں کہ اپنی اس عظیم الشان ذمہ داری کو محسوس کیجیے جس کو آپ نے شعوری طور پر اپنے خدا سے عہد و میثاق مضبوط کر کے اپنے اوپر خود عائد کر لیا ہے۔ آپ کے اس عہد کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ آپ قانون الٰہی کے زیادہ پابند ہوں اور آپ کے عقیدے اور قول و عمل میں کامل مطابقت ہو اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جس میں آپ کے افکار و اعمال اس اسلام سے مختلف ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں بل کہ اس کے ساتھ آپ کے اسی عہد کا تقاضا اور نہایت شدید تقاضا یہ بھی ہے کہ جس اسلام پر آپ ایمان لائے ہیں اور جسے آپ اپنے بادشاہ کا دین سمجھتے ہیں اور جسے آپ تمام نوع انسانی کے لیے حق جانتے ہیں اور واحد ذریعۂ فلاح بھی سمجھتے ہیں اس کو تمام دوسرے دینوں اور مسلکوں اور نظاموں کے مقابلے میں سربلند کرنے کے لیے، اور نوع انسانی کو ادیان باطلہ کے فساد انگیز تباہ کاریوں سے بچا کر دین حق کی سعادتوں سے بہرہ ور کرنے کے لیے آپ میں کم از کم اتنی بے چینی پائی جائے جتنی آج ادیان باطلہ کے پیرو اپنے اپنے جھوٹے اور غارت گر دینوں کی حمایت و برتری کے لیے دکھا رہے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے ان لوگوں کی مثالیں موجود ہیں جو سخت سے سخت خطرات، شدید سے شدید نقصانات، جان و مال کے زیاں، ملکوں کی تباہی اور اپنی اولاد اور اپنے عزیزوں اور جگر گوشوں کی قربانی صرف اس لیے گوارا کر رہے ہیں کہ جس طریق زندگی کو وہ صحیح سمجھتے ہیں اور جس نظام میں اپنے لیے فلاح کا امکان انہیں نظر آتا ہے اسے نہ صرف اپنے ملک پر بل کہ ساری دنیا پر غالب کر کے چھوڑیں۔ ان کے صبر اور ان کی قربانیوں اور محنتوں اور ان کے مصائب پر تحمل اور اپنے مقصد کے ساتھ ان کے عشق کا موازنہ آپ اپنے عمل

سے کر کے دیکھیے اور محسوس کیجیے کہ آپ اس معاملے میں ان کے ساتھ کیا نسبت رکھتے ہیں۔ اگر فی الواقع آپ کبھی ان کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو صرف اسی وقت جب کہ ان حیثیات میں آپ ان سے بڑھ جائیں، ورنہ آپ کے مالی ایثار، آپ کے وقت اور محنت کے ایثار اور اپنے مقصد کے ساتھ آپ کی محبت اور اس کے لیے آپ کی قربانی کا جو حال اس وقت ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو آپ یہ حق بھی نہیں رکھتے کہ اپنے دل میں اس تمنا کو پرورش کریں کہ آپ کے ہاتھوں یہ جھنڈا کبھی بلند ہو۔

دوسری چیز جس کی طرف مجھے آپ کو توجہ دلانے کی بار بار ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ لوگ دین کے اصولی اور بنیادی امور کی اہمیت کو سمجھیں اور فروع کے ساتھ جو اہتمام اب تک کرتے رہے ہیں اور جس اہتمام کی بیماری آپ کے سارے مذہبی ماحول کو لگی ہوئی ہے اس سے بچنے کی کوشش کریں میں دیکھتا ہوں کہ میری اور جماعت کے چند دوسرے صاحب علم ونظر رفقاء کی کوششوں کے باوجود ہماری جماعت میں ابھی تک ان جزئیات کے ساتھ اچھا خاصا انہماک بل کہ غلو پایا جاتا ہے جن پر ایک مدت سے فرقہ بندیاں اور گروہی کش مکشیں ہوتی رہی ہیں، اور یہ کیفیت بسا اوقات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہماری تفہیم سے اس طریقے کو چھوڑنے کے بہ جائے ہمارے بعض رفقاء الٹا ہمیں کو ان بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے جن جزئیات پر آپ لوگ بحثیں کرتے ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں مگر بہ ہر حال یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا ہو اور اپنی کتابوں کو نازل کیا ہو۔ انبیاء کی بعثت اور کتب الٰہی کی تنزیل کا مقصد ان جزئیات کو قائم کرنا نہیں ہیں بل کہ دین حق کو قائم کرنا ہے۔ ان کا اصل مقصد یہ رہا ہے کہ خلقِ خدا اپنے مالک حقیقی کے سوا کسی کی تابع فرمان نہ رہے، قانون صرف خدا کا قانون ہو، تقویٰ صرف خدا سے ہو، امر صرف خدا کا مانا جائے حق اور باطل کا فرق اور زندگی میں راہ راست کی ہدایت صرف وہی مسلم ہو جسے خدا نے واضح کیا ہے اور دنیا میں ان خرابیوں کا استیصال کیا جائے جو اللہ کو ناپسند ہیں اور ان خیرات وحسنات کو قائم کیا جائے جو اللہ کو محبوب ہیں۔ یہ ہے دین اور اسی کی اقامت ہمارا مقصد ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کام پر ہم مامور ہیں۔ اس کام کی اہمیت اگر آپ پوری طرح محسوس کرلیں اور اگر آپ کو اس بات کا بھی احساس ہو کہ اس کام کے معطل ہو جانے

اور باطل نظاموں کے دنیا پر غالب ہو جانے سے دنیا کی موجودہ حالت کس قدر شدت سے غضب الٰہی کی مستحق ہو چکی ہے، اور اگر آپ یہ بھی جان لیں کہ اس حالت میں ہمارے غضب الٰہی سے بچنے اور رضائے الٰہی سے سرفراز ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام قوت خواہ وہ مال کی ہو یا جان کی، دماغ کی ہو یا زبان کی، صرف اقامت دین کی سعی میں صرف کر دیں تو آپ سے کبھی ان فضول بحثوں اور ان لایعنی افکار کا صدور نہ ہو سکے جن میں اب تک آپ میں سے بہت سے لوگ مشغول ہیں۔ میرے نزدیک یہ تمام مشاغل صرف ایک چیز کا نتیجہ ہیں کہ لوگوں نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سمجھا نہیں ہے کہ دین حقیقت میں کس چیز کا نام ہے اور اس کے واقعی مطالبات اپنے پیروؤں سے کیا ہیں؟

ایک اور خامی جو ہمارے بعض رفقاء میں پائی جاتی ہے اور جو اکثر ہمارے لیے سبب پریشانی بنتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اصول اور مقصد اور نظریے کی حد تک تو اس جماعت کے مسلک کو سمجھ گئے ہیں لیکن طریق کار کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ اس لیے بار بار ان کی توجہات دوسری مختلف جماعتوں کے طریقوں کی طرف پھر جاتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کے بطور خود ہمارے نصب العین اور دوسروں کے طریق کار کی ایک معجون مرکب بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب انہیں اس سے روکا جاتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم خواہ مخواہ چلتے ہوئے زود اثر طریق کار کو محض اس تعصب کی بنا پر اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ وہ ہمارا نہیں بل کہ دوسروں کا ایجاد کردہ طریقہ ہے۔ بعض حضرات نے تو ستم ہی کر دیا کہ جب ہماری طرف سے ان کو ٹوکا گیا تو انہوں نے ہمیں یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ نام آپ ہی کا لیا جائے گا دوسروں کا نہ لیا جائے گا۔ گویا ان کے نزدیک ہماری ساری تگ و دو صرف اپنا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک چلانے کے لیے ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ اس جماعت میں شریک ہیں۔ ہماری جماعت کی بعض مقامی شاخیں اس دباؤ سے خاص طور پر بہت زیادہ متاثر ہوئی ہیں، لیکن جہاں تاثر اتنا زیادہ نہیں ہے وہاں بھی مختلف طریقوں سے اس بات کا اظہار ہوتا رہتا ہے کہ کوئی تیز رفتار طریق کار اختیار کر کے جلدی سے کچھ چلتا پھرتا کام دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ یہ سب عمل بلا فکر کی اس پرانی بیماری کے نتائج ہیں جو مسلمانوں میں بہت دنوں سے پرورش پا رہی ہے اور فکر بلا عمل سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ان مذہبی اور سیاسی تحریکوں

میں سے کسی میں بھی فی الواقع کوئی جان ہوتی جو اس وقت مسلمانوں میں چل رہی ہیں تو شاید ہم اس جماعت کی تاسیس میں ابھی کچھ تامل سے کام لیتے اور اپنی پوری قوت ان نسخوں کو آزمالینے میں صرف کر دیتے مگر جو تھوڑی بہت نظر و بصیرت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے اس کی بنا پر ہم خوب اچھی طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ وقت کی چلتی ہوئی تحریکوں اور ان کی قیادتوں میں سے ایک بھی مسلمان کے مرض کا صحیح علاج نہیں ہے، اور نہ اسلام کے اصل منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔ محض جزوی طور پر مسلمانوں کے امراض کی ناکافی اور سطحی تشخیص کی گئی ہے اور اسلام کے اصل تقاضوں کا بھی صحیح طور پر ادراک نہیں کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا گیا کہ کفر و فسق کا یہ غلبہ اور دین کی یہ بے بسی اور مغلوبی جو آج موجود ہے فی الحقیقت کن اسباب کا نتیجہ ہے اور اب اس حالت کو بدلنے کے لیے کس ترتیب و تدریج سے کن کن میدانوں میں کیا کام کرنا ہے۔ ان سب چیزوں کو سوچے اور سمجھے بغیر جو سطحی اور جزئی تحریکیں جاری کی گئیں اور ان کو چلانے کے لیے جو زود اثر فی الفور نتیجہ منظر عام پر لے آنے والے طریقے اختیار کیے گئے وہ سب ہمارے نزدیک چاہے غلط نہ ہوں، چاہے ان کی مذمت ہم نہ کریں، چاہے ان کی اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اخلاص کی ہم دل سے قدر کریں مگر بہ ہر حال ہم ان کو لا حاصل سمجھتے ہیں اور ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ اس قسم کی تحریکیں اگر صدیوں تک بھی پوری کامیابی اور ہنگامہ خیزی کے ساتھ چلتی رہیں تب بھی نظام زندگی میں کوئی حقیقی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا۔ حقیقی انقلاب اگر کسی تحریک سے رونما ہوسکتا ہے تو وہ صرف ہماری یہ تحریک ہے اور اس کے لیے فطرتاً یہی ایک طریق کار ہے جو ہم نے خوب سوچ سمجھ کر اور اس دین کے مزاج اور اس کی تاریخ کا گہرا جائزہ لے کر اختیار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا طریق کار نہایت صبر آزما ہے، سست رفتار ہے، جلدی سے کوئی محسوس نتیجہ اس سے رونما نہیں ہوسکتا اور اس میں برسوں تک لگا تار ایسی محنت کرنی پڑتی ہے جس کے اثرات اور جس کی عمل نمود کو بسا اوقات کرنے والا بھی محسوس نہیں کرسکتا۔ لیکن اس راہ میں کامیابی کا راستہ یہی ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا طریق کار اس مقصد کے لیے ممکن نہیں ہے۔

جن لوگوں کو ہمارے مسلک اور طریق کار یا ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی اطمینان حاصل نہ ہو ان کے لیے یہ راستہ تو کھلا ہوا ہے کہ جماعت سے باہر جا کر اپنی صواب دید سے جس طرح چاہیں کام کریں لیکن یہ اختیار کسی طرح نہیں دیا جاسکتا کہ بطور خود وہ ان دونوں میں یا ان میں سے

کسی ایک چیز میں جو ترمیم چاہیں کرلیں۔ ہمارے ساتھ جس کو چلنا ہے اسے پورے اطمینان کے ساتھ ہمارے مسلک اور طریق کار کو ٹھیک سمجھ کر چلنا چاہیے اور جو شخص کچھ بھی میلان دوسری تحریکوں اور جماعتوں کی طرف رکھتا ہو اسے پہلے ان راستوں کو آزما کر دیکھ لینا چاہیے۔ پھر اگر اس کا ذہن اسی فیصلے پر پہنچے جس پر ہم پہونچے ہوئے ہیں تو وہ اطمینان قلب کے ساتھ ہمارے ساتھ آجائے۔

سطحیت اور مظاہرہ پسندی اور جلد بازی کی جو کم زوری مسلمانوں میں بالعموم پیدا ہوگئی ہے اس کا ایک ثبوت مجھے حال میں ملا ہے کہ عوام میں تعلیم بالغان کے ذریعے سے کام کرنے کا جو طریقہ چند ماہ پیش تر میں نے پیش کیا تھا اس نے تو بہت کم لوگوں کو اپیل کیا مگر گروہ بنا بنا کر بستیوں میں گشت لگانے اور فوری نتیجہ دکھانے والے طریق کار کے لیے (خواہ اس کا اثر کتنا ہی ناپائیدار ہو) مختلف مقامات سے ہمارے رفقاء کے تقاضے برابر چلے آرہے ہیں اور کسی فہمایش پر بھی ان کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ حالاں کہ ایک طرف یہ طریق کار ہے کہ ایک سال یا اس سے زیادہ مدت تک ناخواندہ عوام میں سے چند آدمیوں کو پیہم تعلیم و تربیت دے کر خوب پختہ کرلیا جائے اور ان کے عقائد، اخلاق، اعمال، مقصد زندگی، معیار قدر و قیمت، ہر چیز کو پوری طرح بدل ڈالا جائے اور پھر ان کو اپنی جماعت کا مستقل کارکن بنا کر، مزدوروں، کسانوں اور دوسرے عامی طبقوں میں کام کرنے کے لیے استعمال کیا جائے، اور دوسری طرف یہ طریق کار ہے کہ ایک قلیل مدت میں ہزار ہا آدمیوں کو بہ یک وقت چند ابتدائی امور دین کی حد تک مخاطب کیا جائے اور فوری طور پر ان میں ایک حرکت پیدا کر کے چھوڑ دیا جائے چاہے دوسے چکر کے وقت پہلی حرکت کا کوئی اثر ڈھونڈے بھی مل نہ سکے۔ ان دونوں طریقوں میں سے جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ پختہ نتائج پیدا کرنے والے دیر طلب، محنت طلب اور صبر آزما طریقے کو سنتے ہیں اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے اور دوسرے طریقے کی طرف بار بار دوڑ چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو میرے سامنے مسلمانوں کی وہ کم زوریاں بالکل بے نقاب ہوجاتی ہیں جن کی وجہ سے اب تک وہ خام کاریوں میں اپنی قوتیں اور محنتیں اور اپنے مال اور اوقات ضائع کرتے رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک اس جماعت کی باگیں میرے ہاتھ میں ہیں میں اپنے رفقاء کو صحیح اور حقیقی نتیجہ خیز کاموں ہی پر لگانے کی کوشش کروں گا اور بے حاصل کوششوں میں جانتے بوجھتے ان کو مشغول نہ ہونے دوں گا۔

اپنی تقریر کو ختم کرنے سے پہلے ایک آخری بات کی طرف میں آپ لوگوں کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے حلقۂ رفقاء میں ایک اچھا خاصا گروہ ایسا پایا جاتا ہے جس نے تبلیغ و اصلاح کے کام میں تشدد اور سخت گیری کا رنگ اختیار کرلیا ہے۔ جو سوالات ان کی طرف سے اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں ان سے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اندر بگڑے ہوئے لوگوں کو سنوارنے کی بے تابی اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی انہیں اپنے سے کاٹ پھینکنے کی بے تابی ہے۔ دینی حرارت نے ان میں ہم دردی اور خیر خواہی کا جذبہ اتنا نہیں ابھارا جتنا نفرت اور غصے کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اکثر یہ تو پوچھتے ہیں کہ جو لوگ ایسے اور ایسے ہیں ان سے ہم تعلقات کیوں نہ منقطع کرلیں اور ان کے ساتھ نمازیں کیوں پڑھیں اور ان کو کافر و مشرک کیوں نہ کہیں؟ لیکن یہ پوچھنے کا ان کو بہت کم خیال آتا ہے کہ ہم نے اپنے بھٹکے ہوئے بھائیوں کو سیدھی راہ پر کیسے لائیں، ان کی غفلت و بے خبری کو کس طرح دور کریں، ان کی کج روی کو راست روی سے کیسے بدلیں اور ان کو نور ہدایت سے مستفید ہونے پر کیوں کر آمادہ کریں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے فضل سے اور اپنی خوش قسمتی سے حق کو پالیا ہے ان کے اندر اس وجدان حق نے شکر کے بجائے کبر کا جذبہ پیدا کردیا ہے اور اسی کا اظہار ان شکلوں میں ہو رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ میرا یہ گمان صحیح ہو لیکن میں اسے صاف صاف اس لیے بیان کررہا ہوں کہ ہمارے رفیقوں میں سے ہر شخص پوری خدا ترسی کے ساتھ اپنے نفس کا جائزہ لے کر تحقیق کرنے کی کوشش کرے کہ کہیں شیطان نے یہ مرض تو ان کو نہیں لگا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے درمیان علم صحیح اور عمل صالح رکھنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وبائے عام میں مبتلا ہو جانے والی بستی کے درمیان چند تندرست لوگ موجود ہوں جو کچھ طب کا علم بھی رکھتے ہوں اور کچھ دواؤں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہو۔ مجھے بتایئے کہ اس وبا زدہ بستی میں ایسے چند لوگوں کا حقیقی فرض کیا ہے؟ کیا یہ مریضوں سے اور ان کو لگی ہوئی آلائشوں سے نفرت کریں یا انہیں اپنے سے دور بھگائیں اور انہیں چھوڑ کر نکل جانے کی کوشش کریں یا یہ کہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ان کا علاج اور ان کی تیمار داری کرنے کی فکر کریں اور اس سعی میں اگر کچھ نجاستیں ان کے جسم و لباس کو لگ بھی جائیں تو انہیں برداشت کرلیں۔ شاید میں پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اگر یہ لوگ پہلی صورت اختیار کریں تو خدا کے ہاں الٹے مجرم قرار پائیں گے، اور ان کی

اپنی تن درستی اور ان کا علم طب سے واقف ہونا اور ان کے پاس دواؤں کا ذخیرہ موجود ہونا نافع ہونے کے بہ جائے الٹا ان کے جرم کو اور زیادہ سخت بنادے گا۔ اسی پر آپ قیاس کرلیں کہ جن لوگوں کو دینی تن درستی حاصل ہے اور جو دین کا علم اور اصلاح کے ذرائع بھی رکھتے ہیں ان کے لیے کون سا طریقہ رضائے الٰہی کے مطابق ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

دعوت اسلامی
اور
اس کی کامیابی کے اصول

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

حاضرین! میں یہاں مسلسل مشغولیت اور انہماک کی وجہ سے اب اتنا تھک چکا ہوں کہ اس وقت کوئی اچھی خدمت سرانجام نہیں دے سکتا۔ لیکن موقع مل جانے کے بعد فرصت کی ناقدری ہوگی اگر چند اور ضروری باتیں آپ کے کانوں تک نہ پہنچادوں۔ ان کے پہنچانے کا مقصد ایک تو یہ ہے کہ آپ خود غور فرمائیں اور دوسرا یہ کہ اگر آپ ان سے متفق ہیں تو ان کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ میں اس وقت جماعت اسلامی کی نسبت چند حرف کہوں گا۔ اور یہ امر واضح کروں گا کہ یہ جماعت کن اساسات پر قائم ہے۔ میں اس جماعت سے تعلق رکھتا ہوں اور میں نے اس بنیاد پر اس کا تعلق قبول کیا ہے کہ میں نے پورے یقین کے ساتھ، جہاں تک میری علمی بصیرت ہے محسوس کیا ہے کہ یہ چند ایسے مسلم اساسات پر قائم ہے جن کے بارے میں مسلمانوں کی رائیں دو نہیں ہیں۔ ہم سب کا ان پر اتفاق ہے۔ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے بارے میں بھی مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہم کو اور آپ کو اسلام سے جو نسبت حاصل ہے وہ اس رشتے کی بنا پر ہے جو ہمارا اللہ اور اس کے آخری رسول

سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو احکام اور قوانین دیے ہیں اور محمد ﷺ نے جس دین کی دنیا کو دعوت دی ہے اس کا تعلق ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو مسلم اور مسلمان کہتے ہیں۔ اگر ان چیزوں میں سے کسی چیز کے ساتھ ہمارا رشتہ ضعیف ہو جائے تو اسلام کے ساتھ ہماری نسبت بھی ضعیف ہو جائے گی۔ اور اگر منقطع ہو جائے تو اسلام سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اس زنجیر کے ٹوٹنے کے بعد دنیا کے کارخانوں کی بنی ہوی کتنی ہی سنہری اور روپہلی زنجیریں لائی جائیں لیکن اسلام کے ساتھ ہمارا رشتہ کسی طرح بندھ نہیں سکتا۔ آج کل قوموں اور جماعتوں کی اجتماعی شیرازہ بندی میں جن چیزوں کو اصلی دخل ہے وہ قومیت اور وطنیت ہے، ملک کا اشتراک ہے، نسل ہے، خون ہے، رنگ ہے۔ جن لوگوں نے تمدنی مسائل پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ انہیں اساسات پر حلقے بنتے ہیں، قومیں بنتی ہیں، تہذیب کے خط وخال نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک انگریز کی انگریزیت ایک جرمن کی جرمنیت، اور ایک جاپانی کی جاپانیت، اس کے نسب، نسل اور ملک کی بنا پر قائم ہے۔ لیکن ایک مسلمان خواہ وہ کتنا ہی غبی ہو (حالاں کہ غبی نہیں ہوتا) کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ یہ چیزیں اسلامی اجتماعیت کی تشکیل میں بھی چونے اور گارے کا کام دے سکتی ہیں۔ اسے خوب معلوم ہے کہ مسلمان کا اسلام سے رشتہ اللہ اور اس کے رسول سے تعلق کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور یہی اللہ اور اس کے رسول کا رشتہ ایک مسلمان کو مسلمان سے جوڑتا ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول سے اپنا رشتہ کاٹ لے وہ اسلام سے منقطع ہو گیا اور جس نے اسلام سے علاحدگی اختیار کرلی اس نے اسلامی ہیئت اجتماعیہ میں اپنی جگہ کھودی۔ آپ کو ان سڑکوں پر چلتا پھرتا ایک معمولی چمار جس کو پشت ہا پشت سے اسلام سے کوئی نسبت حاصل نہ رہی ہو اگر ابھی ان اساسات کا اقرار کرلے جن کی حضور نبی کریم ﷺ نے تعلیم دی ہے تو وہ معاً اسلام میں داخل ہو جائے گا اور آپ کی مسجد میں حقدار ہوگا کہ اگلی صفوں میں جگہ پائے۔ لیکن ایک شخص جس کا خاندان پشت ہا پشت سے مسلمان ہے اور شیخ الاسلام کے عہدے پر متمکن چلا آیا ہے اس کا کوئی ناخلف فرزند اگر اصول اسلام میں سے ایک اصل کا بھی انکار کرتا ہے تو کوئی نہیں ہے جو اسے ہماری صف پائیں میں بھی جگہ دلا سکے اگر چہ اس خاندان کو خاندان رسالت ہی سے نسبت کیوں نہ حاصل ہو۔ نسل، نسب، خاندان اور وطن اسلامی تصور میں بالکل بے معنی ہیں۔

اسلام کے اساسی معتقدات اور ان کا مفہوم

اب آیئے غور کیجیے کہ اسلام جس کی نسبت ہی سے ہماری تمام کائنات ہے اس کے وہ اساسی معتقدات کیا ہیں جن پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور جن کو صدق دل سے مانے بغیر نہ آدمی اسلام میں داخل ہوتا ہے اور نہ ان پر قائم رہے بغیر اسلام پر قائم رہتا ہے۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔ لیکن ایمان باللہ کا مطلب صرف زبان سے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کہہ دینا نہیں ہے۔ اتنے کا اقرار تو ابوجہل ابولہب کو بھی تھا۔ پس یہاں تک آپ ان سے کچھ آگے نہیں ہیں۔ بل کہ اس حد تک دنیا کے اکثر افراد آپ کے برابر ہیں۔ دنیا کی پچھلی تاریخ خدا کے انکار مطلق سے بالکل خالی ہے۔ دنیا کو ہمیشہ خدا کا اقرار رہا ہے۔ یہ صرف موجودہ عہدِ روشن کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں کچھ بے بصیرت بھی پیدا ہو رہے ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کا مفہوم صرف یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ اقرار کی حد تک اللہ کا اقرار کرلیں۔

ایمان باللہ

بل کہ ایمان باللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ پر، اس کی ان تمام صفات واسمائے حسنیٰ کے ساتھ جو شان الوہیت کے لیے موزوں ہیں اور جن کی انبیاء علیہم السلام نے تعلیم دی ہے ایمان لایا جائے، یعنی یہ کہ ہم اس کے بندے ہیں، غلام ہیں، ہماری مرضی اور ہماری خواہش اس کے حکم کے آگے کچھ نہیں، صرف وہی حاکم علی الاطلاق ہے، خالق و مالک وہی ہے، قانون دینے والا، شریعت بنانے والا وہی ہے، نفع وضرر پہنچانے والا اور مدبر کل وہی ہے۔ ان صفات کا مستحق اور کوئی نہیں۔ اگر اس کی صفات میں سے کسی صفت میں دوسرے کی حصہ داری مان لی جائے یا خدا کے اختیارات میں کسی کو شریک کردیا جائے تو تمام ایمان ہی غارت ہو جائے گا اس میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے۔

پھر ہم خدا کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہم کو پیدا کر کے اس نے ہمیں اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے کہ جدھر چاہیں بھٹکتے پھریں۔ یا یہ کہ وہ ہندوؤں کے مہادیوں کی طرح محض

ڈنڈوت کر لینے پر راضی ہو جاتا ہے بل کہ خدائے تعالیٰ نے جس طرح ہماری مادی زندگی کے لیے اسباب فراہم کیے ہیں ٹھیک اسی طرح اس نے ہماری ہدایت کے لیے انبیاء ورسل بھیجے ہیں۔ اور جس طرح اس نے ہم سے اپنی پرستش کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح اس نے اپنی اطاعت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ صرف یہ چیز کافی نہیں ہو سکتی کہ ہم زبان سے اس کی تعریف کر دیں یا صرف پانچ وقت نمازیں پڑھ لیں، بل کہ اس کی فرماں برداری و اطاعت بھی لازمی ہے۔ اور یہ اطاعت زندگی کے کسی ایک ہی گوشے میں نہیں ہے بل کہ ہر گوشے میں ہے۔ مسلمان صرف مسجد کے اندر ہی اللہ کا بندہ نہیں رہتا بل کہ اسے ہر جگہ اللہ کے قانون اور اس کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ ہندو اور غیر مسلم کا دین صرف مندر اور معبد میں اس سے چپک جاتا ہے لیکن مسلمان کا دین ہر جگہ اس کے ساتھ ہے۔ مسجد میں، گھر میں، بازار میں، دکان میں، کھیتی باڑی میں، لین دین میں، سیاست میں، حکومت میں، معیشت میں اور تہذیب و تمدن میں غرض کوئی جگہ نہیں ہے جہاں خدا کا دین سانس کی طرح مسلمان کے ساتھ نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی یہ اطاعت اس کے انبیاء کی اطاعت کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ جس طرح اللہ کو ماننے کا مطلب محض اٰمَنۡتُ بِاللّٰہِ کہنا نہیں ہے بل کہ اللہ کو شارع، مالک، قانون ساز، مدبر ماننا ہے اسی طرح رسول کو ماننے کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ ہم اس کے رسول ہونے کا اقرار کر لیں۔ اگر ہم صرف اقرار کی حد تک رسول کو مانتے ہیں تو مدینے کے منافقین اس معاملے میں ہم سے پیچھے نہ تھے۔ وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں مگر اللہ نے انہیں صادق القول تسلیم نہیں کیا، بل کہ فرمایا: وَاللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ ”اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں“ آپ اللہ کے رسول ہیں مگر یہ اپنے قول میں صادق نہیں ہیں۔

ایمان بالرّسالت

کیوں کہ رسول کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے واجب الاطاعت مانیں، زندگی کے ہر گوشے میں خدا کے نائب اور رسول ہونے کی حیثیت سے اس کی رہبری تسلیم کریں، اس کے خلاف جو کچھ ہے اسے غیر فطری اور خدا سے انحراف یقین کریں اور اس سے فطری دشمنی رکھیں اور جو اس کے مطابق ہے اس سے فطری محبت ہو وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ

''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔'' رسول کی رسالت کے اقرار کا حق اس سے نہیں ادا ہو جاتا کہ اس کا نام آتے ہی انگلیوں کو چوم کر آنکھوں سے لگالیں، یا میلاد کی مجلسیں قائم کر دیں، یا رسول کے نام پر جھنڈا لے کر سڑکوں اور گلیوں کا طواف کرتے پھریں۔ رسول درحقیقت واجب الاطاعت بن کر آتا ہے۔ کسی شعبے میں اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کو اپنی رضا سے تسلیم کرنا اللہ اور اس کے رسول سب کا انکار ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں اسے مطاع مانیے، اس کے بغیر ہزاروں میلادیں کر کے اور لاکھوں جھنڈے اٹھا کر اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ نے رسول ماننے کا حق ادا کر دیا اور آپ اس کی شفاعت کے حقدار ہو گئے یا اس کی تعلیمات کا مذاق اڑا کر اور پوری زندگی میں اس کے خلاف چل کر اگر آپ امید رکھتے ہیں کہ ٹھنڈے ٹھنڈے جنت کو چلے جائیں گے تو پوری ذمہ داری کے ساتھ میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ جھوٹا وہم اور کوئی نہیں۔ آپ کو مجبور کر کے اسوۂ رسول سے ہٹایا جاسکتا ہے لیکن رسول کے اسوہ سے اگر آپ خود بھاگ کھڑے ہوں، اس کو آپ خود مطاع نہ مانیں تو رسول کو رسول ماننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یاد رکھیے کہ رسول کی تعلیم کے خلاف شک نفاق ہے اور اس کی مخالفت کفر ہے۔

اللہ نے جو دین آپ کو دیا ہے اس کا نام اسلام رکھا ہے۔ اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو بالکلیہ اللہ کے حوالے کر دینا۔ اس کی تشریح قرآن نے اس طرح کی ہے ''اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً'' اللہ کی اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یعنی آپ اپنی زندگی کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس دین کی پیروی کرنی پڑے گی۔ کاروبار کریں، ملازمت کریں، تعلیم دیں، کمپنی کھولیں، گھر میں ہوں یا سوسائٹی میں، بین الاقوامی امور ہوں یا ملکی معاملات، سب میں اللہ کے دین کی پوری پوری پیروی کرنا، اپنے کو اللہ کے حوالے کر دینا اسلام ہے اور مسلم وہی ہے جو اس مفہوم میں اسلام کا حامل ہو۔ اسلام سے انحراف مجبوراً ہو سکتا ہے یا نفس کے غلبے کی بنا پر، یا جہالت کی وجہ سے۔ مثلاً کوئی مضطر مجبوراً خنزیر کھالے، یا کوئی شخص ہیجان نفس کی وجہ سے کوئی ناجائز حرکت کر بیٹھے، یا غفلت کی وجہ سے کسی کا پاؤں غلاظت کے ڈھیر پر پڑ جائے۔ پہلی صورت میں انسان کا فرض ہے کہ اس حالت سے نکلنے کی جدوجہد کرے، دوسری حالت میں انسان کا فرض ہے کہ فوراً توبہ کرے، تیسری صورت میں اس کو چاہیے کہ جلد سے جلد اپنے آپ کو پاک کرے۔ لیکن اگر وہ غلاظت کے ڈھیر پر اپنا بستر بچھائے، وہیں اولاد پیدا کرنا

شروع کر دے، وہیں اپنی نسل کو پروان چڑھائے اور اس پر فخر بھی کرے کہ ہم نے شیش محل بنوالیا ہے اور آپ بھی اسے قابل رشک مسلمان سمجھنے لگیں تو یہ ایک غلط فہمی ہے جس سے اپنے دماغ کو پاک کیجیے۔ اس کا غلط ہونا مسلم ہے۔ کوئی غبی ہی ہو گا جو اس میں شک کرے۔

ایمان بالکتاب

رسول کے علاوہ خدائے تعالیٰ نے کتاب بھیجی ہے۔ وہ جنتر منتر کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ غیر مسلم بھی مانتے ہیں کہ یہ آسمان کے نیچے کی ان کتابوں میں سے ہے جن سے دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ صالح انقلاب برپا کیا۔ یہ قوموں کے لیے عروج و زوال کا پیمانہ بن کر نازل ہوئی ہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے عرب کی گئی گزری قوم کو دنیا کی قوموں کا امام بنا دیا۔ اور دوسری تمام بڑی بڑی قوموں کے فاسد تمدنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اس نے اونٹ چرانے والوں کے ہاتھوں سے اونٹوں کی نکیل لے لی اور قوموں کی قیادت کی باگ ان کے ہاتھوں میں دے دی۔ اور ان ہی اونٹ چرانے والوں میں اس کے فیض سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ پوری انسانیت کی تاریخ ان کے ناموں سے روشن ہے۔ یہ کتاب ہماری زندگی کے ہر گوشے کے لیے ہدایت بنا کر بھیجی گئی ہے۔ یہ فرمان الٰہی ہے، واجب الاطاعت ہے۔ اس میں شک اور تفریق کی گنجایش نہیں۔ کوئی مسلمان جان بوجھ کر اور ٹھنڈے دل سے اس سے منحرف ہو کر اپنے تئیں مسلمان نہیں باقی رکھ سکتا۔ جب تک اس کے دم میں دم ہے وہ اس پر جما رہے گا۔ اگر جہالت کی وجہ سے اس سے بھٹک جائے گا تو یہ دوری ایسی ہو گی جیسی ایک مچھلی کی دوری تالاب سے۔ وہ بہ ہر صورت اس سے علاحدگی پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ اگر چہ اس کا سر تن سے جدا ہو جائے، اگر چہ اس راہ میں اسے سب کچھ کھو دینا پڑے۔

اس کتاب عزیز کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت صرف یہ نہیں ہے کہ اگر وہ کبھی زمین پر گر جائے تو اس کے برابر گیہوں تول کر صدقہ کر دیا جائے۔ اس کا جزودان نہایت عمدہ مخمل کا ہو۔ سنہری الماری میں اسے رکھا جائے۔ اور ہر گز ہر گز یہ بھی نہیں کہ کوئی مرنے لگے تو اس پر سورۂ یٰسین پڑھ کر دم کر دیجیے۔ وہ جان نکالنے کے لیے سہولت کا نسخہ ہی بن کر نہیں آئی ہے، بل کہ انسان کے

لیے ہدایت اور حیات کا سرچشمہ بن کر آئی ہے۔ سورج تاریک ہو جائے تو جہان تاریک نہ ہوگا، چاند بے نور ہو جائے گا تو دنیا اندھیری نہ ہوگی، ستارے جھڑ جائیں تو کوئی انقلاب برپا نہ ہوگا، لیکن اگر قرآن جہاں سے غائب ہو جائے تو پھر دنیا کو کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔ وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْراً فَمَالَہٗ مِنْ نُوْرٍ۔

یہ کتاب عزیز وہ ہے جو تہذیب و تمدن اور نیکی و سعادت کا سرچشمہ ہے۔ اس ظالم انسان کے جواب میں جس نے کہا تھا کہ ''جب تک یہ کتاب باقی ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا''۔ میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی تباہی بھی دنیا سے نیکی اور امن و عدل کے آثار نہیں مٹا سکتی، اگر یہ کتاب صفحۂ عالم پر موجود ہے۔ اسے جاننا، اس پر ایمان لانا، اس کے مطابق عمل کرنا، اسے نوک زبان کرنا، اس کے علم و عمل کو وراثت میں منتقل کرنا اس کے لیے گردن کٹانا ہمارے فرائض اور اس کتاب کے حقوق میں سے ہے۔ یہ ہمارے دین کے مسلمات سے ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ہمارا رشتہ خون کی بنا پر نہیں ہے اس کتاب کی بنا پر ہے جو اس کو مانتا ہے وہ ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں۔ اور جو اس سے منحرف ہے نہ وہ ہمارا ہے نہ ہم اس کے ہیں۔ نَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ۔

ہمارے مدرسوں کے امتحان میں کچھ سوالات اختیاری بھی ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اختیاری ہو ہم کو پورا قرآن ماننا پڑے گا۔ اس کی ایک چیز کا انکار سب کا انکار ہے خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، خداوند تعالیٰ ہمارا محتاج نہیں ہے کہ ہم جتنی بھی اس کی اطاعت کریں اتنے ہی پر راضی ہو جائے کہ چلو، اگر یہ سو فیصدی مطیع نہیں ہیں تو اس سے پچاس فیصدی ہی قبول کر لو۔ نہیں بل کہ رسول کو حکم ملا ہے کہ پورے کا پورا قرآن پیش کریں۔ جسے لینا ہے اسے پورا لے ورنہ پورا چھوڑ دے آپ کو معلوم ہے کہ اہل بردہ نے کس چیز کا انکار کیا تھا؟ صرف زکوٰۃ ہی کا تو کیا تھا۔ صحابہ کی مجلس میں معاملہ پیش ہوا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اگر انھوں نے ایک بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کیا تو میں ان سے جہاد کروں گا اور اگر اور کوئی تیار نہ ہوگا تو میں تن تنہا تلوار لے کر نکلوں گا۔ سب صحابہ نے اس سے اتفاق کیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ احکام دین میں ہم کسی قسم کی تفریق و تقسیم نہیں کر سکتے۔

حق و باطل کے معرکے میں ہمارا فرض

اسلام کے ساتھ ہماری نسبت ان مسلمات ہی کے تسلیم کرنے سے قائم ہے۔ یہ بنیادی اصول ہیں جن پر ہم سب مسلمان متفق ہیں۔ ان پر قائم رہنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ ترغیب سے ترہیب سے اور دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے خدا سے بغاوت کی راہ پر لائے۔ لیکن ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم کم سے کم اتنی ہمت تو دکھائیں کہ شیطان کو دانتوں پسینہ آ جائے۔ یہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو بزدلانہ طاغوت کے بالکل حوالے بھی کر دیں اور دینداری کا دعویٰ بھی کرتے رہیں، خدا سے تعلق بھی رکھیں اور اہرمن سے بھی۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہیے تو عرض کر دوں۔ کوئی مسلمان ہوا لیکن اس کے باوجود جب وہ کسی مندر کے سامنے سے گزرتا تو مورتیوں کے آگے ڈنڈوت بھی کر لیتا۔ کسی نے کہا کہ مسلمان ہونے کے بعد یہ حرکت اچھی نہیں ہے۔ اس نے کہا ''بھئی بگاڑ کسی سے اچھا نہیں ہے'' دین حق میں معاف کیجیے اس رواداری کی گنجائش نہیں ہے۔ مسیح علیہ السلام نے کہا ہے ''جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے۔'' یہی بات اگر انگریز کہنے کی جرأت کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کہہ سکتے؟

حق و باطل کی لڑائی قدیمی ہے جو باوا آدم کے وقت سے چلی آ رہی ہے۔ یہ جنگ عقلی بھی ہے اخلاقی بھی ہے اور مادی بھی۔ ہم ایک ہی ساتھ اللہ اور اہرمن دونوں کو خوش نہیں کر سکتے۔

میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ دین کے مسلم مسائل ہیں۔ کیا مسلمان موجودہ حالات میں اسلام کے ان مقتضیات کو پورا کر رہے ہیں؟ ہم تو ٹھنڈی سڑک سے جنت تک پہنچنا چاہتے ہیں حالانکہ ''حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمُكَارِهِ'' ''جنت ناگوار شدائد سے گھیر دی گئی ہے'' یہ حضورؐ نے فرمایا ہے ہمیں لامحالہ جان و مال کی بازی کھیلنی پڑے گی اس طرح کی سہل پسند قسم کی زندگی صرف ایک شکل میں اختیار کی جا سکتی ہے کہ آدمی کا کوئی اصول نہ ہو۔ لیکن جب کوئی اصول اختیار کیا جائے گا تو زندگی کی راہ کانٹوں سے بھر جائے گی۔ یا تو ہر تیز رو کے پیچھے بھاگیے یا ایک اصول اختیار کرنے کے بعد اس کے لیے تن من اور دھن کی قربانی کیجیے۔ دو دونی کر چار ہوتے ہیں۔ اگر آپ اتنی سی بات بھی مان لیتے ہیں تو حساب درست کرنے کے لیے راتوں کو کتنی نیند خراب کرنی پڑتی ہے اور کتنا تیل جلانا پڑتا ہے لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ دو دونی کر چار بھی ہوتے ہیں اور چھ

بھی، آٹھ بھی ہوتے ہیں اور سولہ بھی تو پھر دردسری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ غور کیجیے جب مسلمان اتنے مسلمات مانتا ہے تو اسے کتنا خون جلانا پڑے گا۔

مسلمانوں کے اقسام

اس وقت کے مسلمانوں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اقسام بے شمار ہیں سمجھتا ہوں کہ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سانپوں کی قسمیں گن سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی اقسام شمار نہیں کی جاسکتی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کی اتنی قسمیں نہیں ہوسکتی ہیں۔ مسلمان صرف ایک ہی قسم کا ہوسکتا ہے، اللہ اور اس کی شریعت کا پابند، رسول اور اس کی تعلیمات کا فرماں بردار، ان مسلمات کا اعتراف اور پھر ان سے بغاوت دو متضاد باتیں ہیں جن کا افسوس ہے اس زمانے میں کم لوگوں کو شعور ہے۔

دنیا کی کوئی قوم بھی اتنے سچے اور پکے اصولوں کو نہیں مانتی جتنے کہ آپ مانتے ہیں پھر بھی آپ اتنی میٹھی نیند سو رہے ہیں کہ آپ کے دشمنوں کو بھی حیرت ہے۔ جس نے بھی کوئی اصول اپنایا اسے قربانیاں لازمی طور پر کرنی پڑیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں موجودہ حالات پر نظر ڈالیے۔ جس نے کہا جمہوریت ہمارا مسلک ہے۔ دیکھیے اس کو یہ سودا کتنا مہنگا پڑا۔ بعض نے کہا کہ ہم ڈکٹیٹرشپ کے قائل ہیں۔ اور ساتھ ہی انہیں جان و مال کی بازی لگا دینی پڑی۔ روس نے نہ جانے کس عالم میں کہہ دیا تھا کہ فلاح عالم اشتراکیت میں ہے نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ پورے کا پورا ملک تہس نہس ہوگیا۔ نازی ازم اتنی جان نثاری کا مطالبہ کرے، اشتراکیت کے سربکف جاں فروشوں کی تعداد اس قدر عظیم الشان ہو، جمہوریت کی حمایت کے لیے اتنے سرفروش تن من دھن کی بازی لگا رہے ہوں مگر آپ خدا اور اس کے دین کو مان کر کتب قدیمہ کی زبان میں پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک ہوکر اور قرآن سے خیر الامم کا خطاب پاکر آپ کے بستر میں ایک کانٹے کی خلش بھی نہ ہو۔ اور پھر بھی سب حقوق ادا ہوتے رہیں، جس راہ پر چاہیں چلیں، اور پھر بھی کوئی اصول نہ ٹوٹے۔ کس قدر اچنبھے کی بات ہے! موجودہ پڑھے لکھے انسان جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں، اور خود کسی اصول کو مانتے ہیں حیرت میں ہیں کہ آپ لوگ کیسے سکھ کی نیند سو رہے ہیں۔ جس کی حفاظت میں اتنا بڑا خزانہ ہو اس کی یہ بے فکری تعجب انگیز ہے!

یہ اگر مسلم مقاصد ہیں اور آپ نے ان کو مانا ہے تو ان کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے پہلے خود انھیں اختیار کیجیے، پھر اللہ کے بندوں میں ان کو پھیلایئے، ان کے لیے گھر سے لے کر باہر تک اور شہر سے لے کر ملک تک آپ کو ہر جگہ جان جوکھم کا کام کرنا ہوگا۔ موجودہ زمانے میں لاکھوں بل کہ کروڑوں کی تعداد میں ایسے انسان موجود ہیں جنھوں نے اپنے باطل اصولوں کی خاطر گھر چھوڑا، وطن چھوڑا، اعزا، خاندان اور قوم سب کو قربان کیا۔ ایسے انسان ہزار ہا موجود ہیں۔ جو عین دشمن کے ملک میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے جست لگاتے ہیں۔ دنیا باطل کے لیے جوش و ولولے کا اظہار کرے مگر صرف حق ہی ایک ایسا مظلوم ہے جس کے لیے چوٹ کھانے والے سینے نہیں ہیں، جس کے لیے رگوں کا خون خشک ہوگیا ہے، جس کے لیے جیبوں میں مال موجود نہیں ہے۔ اللہ اکبر کیسا عجب ماجرا ہے؟ کیا حق کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا اور کیا وہ کسی چیز کا بھی مستحق نہیں ہے؟ آج وہ مسلمان جو خدا اور رسول کے اصولوں کو اپنا اصول تسلیم کیے ہوے ہیں کہاں سوئے ہوے ہیں؟ یا تو یہ کہیے کہ یہ مقصد گھٹیا ہے یا گھٹیا نہیں ہے بل کہ تمام مقصدوں میں سب سے ارفع یہی ہے تو بتایئے کہ قیامت کے دن آپ کا کیا جواب ہوگا جب کہ اس آسمان کے نیچے کوئی جماعت آج ایسی نہیں ہے جو اس حق کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوے ہو؟ صرف کسی جزئی حق کو نہیں بل کہ پورے کے پورے کو کیوں کہ ویسے تو دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہو سکتی جس کے مقاصد میں کچھ نہ کچھ حق کے اجزاء شامل نہ ہوں۔ اس کے بغیر تو کوئی جماعت وجود ہی میں نہیں آسکتی دنیا میں مجرد باطل کا وجود ناممکن ہے ایسا ہونا اس کائنات کے خلاف ہے ہمارا سوال ایسی جماعت کے لیے ہے جو حق کو بہ حیثیت مجموعی لے کر اٹھے اس طرح جس طرح صحابہؓ لے کر اٹھے تھے۔

جماعت اسلامی اور اس کے قیام کی غرض

جماعت اسلامی کا قیام اسی مقصد حق کے لیے ہے۔ ہم ان مسلمانوں کو چھانٹ چھانٹ کر جمع کر رہے ہیں جو اس پورے حق کو لے کر اٹھنے کا عزم رکھتے ہیں اور ان سے ایک جماعت کی تشکیل کر لی ہے اس طرح ہم اسلام کے ان مقاصد کو ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو صرف جماعتی زندگی میں پورے ہو سکتے ہیں۔ ابھی یہ جماعت کم زور اور ضعیف ہے۔ لیکن اگر

کچھ ذرے اکٹھے ہوگئے اور اللہ تعالیٰ نے ان ذروں میں کبھی گرمی وحرارت پیدا کی اور ان میں کچھ صلاحیت پیدا ہوگئی، تو کیا عجب ہے کہ اس کم زور جماعت کے ہاتھوں دین کی وہ خدمت انجام پائے جو اللہ کو، اس کے رسول کو اور تمام مومنین کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ ہمیں اس کام کے لیے سچا خادم بنادے!

ان امور میں کسی کے لیے اختلاف کی گنجایش نہیں ہے۔ یوں تو بحث کرنے کے لیے سب کے منہ میں زبان ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلم ہیں۔ کوئی جماعت نہ تھی جو اس مقصد خالص کے لیے جدوجہد کررہی ہو۔ باطل سے باطل مقاصد کے لیے جماعتیں ہوں، ان کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کرنے والے ہوں لیکن اس آسمان کے نیچے جو سب سے بڑا مقصد ہو اسی کے لیے کچھ نہ ہو۔ کس قدر غم انگیز بات ہے۔ اس مقصد کے لیے خدا کے بندے اکٹھے ہوگئے ہیں، سمجھانے اور سمجھنے میں ذرا دیر لگے گی۔ مگر دنیا سمجھے گی ضرور، اور اگر نیتوں میں خلوص ہے تو جس وقت شیطان اپنی فوج لے کر نکلے گا تو ہم اس مبارک ذات کے اسوہ کی پیروی کریں گے جس نے ہزاروں غرق آہن جنگجوؤں کے سامنے تین سو تیرہ بے سروسامان لا کھڑے کیے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں کے ذریعے سے حق کا بول بالا کیا تھا۔

پھر اگر ہم نے اس جدوجہد میں بازی پالی تو فہو المراد اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا راستہ ہے جس میں ناکامیابی کا کوئی سوال نہیں اس میں اول قدم بھی منزل ہے اور آخر بھی ناکامی کا اس کوچے میں گزر ہی نہیں ہے۔ اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے پھر اگر تیز سواری مل گئی تو فبہا، یہ نہ سہی تو چھکڑے ملیں گے انہیں سے سفر ہوگا۔ یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں ان سے چلیں گے، پاؤں بھی نہ رہیں گے تو آنکھیں تو ہیں ان سے نشان دیکھ لیں، گے، آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے جس کی بصارت کوئی سلب نہیں کرسکتا بشرطے کہ ایمان موجود ہو۔ ’’اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ‘‘ میری نماز میری قربانی میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ پس وسائل کار اور اسباب راہ کا سوال ہمارے یہاں بالکل ضمنی ہے۔

کامیابی کا معیار

دوسری راہوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کہاں تک پہنچے، زادراہ کیا ہے اور منزل کتنی باقی ہے۔ کامیابی کے امکانات کا حساب ہوتا ہے۔ لیکن ہماری کامیابی کا معیار یہ ہے، کہ حسن نیت اور اخلاص کس قدر تھا؟ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ کتنے قدم چلے، پہلے قدم پر موت آ گئی تب بھی کامرانی ہے اور منزل تک پہنچ گئے تو پھر کہنا ہی کیا ہے۔ ایمان خالص اس سفر میں زادراہ ہے اور عزم صادق راحلہ ہے۔ جو اپنی جانیں اللہ کی نذر کر چکے وہ کامیاب ہو چکے، جو باقی ہیں وہ ایک دن نذر گزران دیں گے۔ کامیاب ہو جائیں گے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ط

کامیابی و ناکامیابی کا حساب نہ لگایئے، مجھے فی صد کے لفظ سے سخت نفرت ہے۔ یہ کام بہ ہر حال ہمیں کرنا ہے، حالات نامساعد ہیں تو ہوا کریں، دنیا میں کب حق کا خیر مقدم کیا گیا ہے؟ کب ایسا ہوا ہے کہ اہل حق چلے ہوں اور چوبداروں نے ان کے آگے ''ہٹو بچو'' کی صدائیں بلند کی ہوں۔ حق کی راہ میں طائف اور غار ثور، خندق اور احزاب کا ہونا ضروری ہے۔ حق کی خاطر رسول کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، دندان مبارک شہید کیے گئے، سر پر اوجھ ڈالی گئی، ہر طرح کی اذیت پہنچائی گئی بدقسمت ہیں ہمارے وجود اگر ہماری ایک بھی ہڈی نہ ٹوٹے۔ حق پرستی کی راہ میں کب مشکلات حائل نہ تھیں۔ تاریخ کا جو ورق حق کے لیے مشکلات، سے خالی نہ ہو اسے اٹھا کر لایئے میں اس کو چوم لوں۔

مشکلات تو اس راہ میں اعوان و انصار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خوب سمجھ لیجیے کہ یہاں ناکامیابی کا وجود ہی نہیں۔ نہ صرف یہ کہ ایک قدم بھی اٹھ جائے تو کامیابی ہے بل کہ جس راستے پر آپ گامزن ہیں۔ اگر اس سے آپ پیچھے ہٹ جائیں۔ جب بھی کامیابی ہے، بشرطے کہ آپ خود پیچھے نہ بھاگے ہوں۔ اہل حق نے شکستیں بھی کھائیں لیکن ان کی شکستوں پر ہزارہا فتح مندیاں قربان یہ کس قدر مضحکہ انگیز بات ہے کہ شیطان سے پورا تعاون کیا جائے اور ''ربنا ثبت اقدامنا'' کی دعا مانگی جائے۔ اس دعا کے اثرات کو تو وہ قلب مؤمن ہی جان سکتا ہے جس کے سر پر راہ حق میں اوجھ ڈالی گئی، جس کے دندان مبارک زخمی ہوے، طائف کی پتھریلی زمین میں

جس کے پاؤں لہولہان ہوئے، جب وہ کہتا ہے "ربنا ثبت اقدامنا" تب زمین سے آسماں تک لرزہ پڑ جاتا ہے۔ خدا نے اپنی کتاب میں کوئی بے معنی بات نہیں فرمائی ہے سوچیے تو سہی اگر کوئی آدمی حق کو پیٹھ دکھادے اور پھر دعا کرے کہ اے پروردگار مجھے ثابت قدم رکھ تو اس کی یہ دعا کتنی بے معنی ہوگی؟ بہ ہر حال ہماری پکار اسی راستے کے لیے ہے۔ بدگمانیوں کا ہمارے پاس کوئی مداوا نہیں ہے لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ اللہ کے پیغام کے علاوہ ہمارا کوئی پیغام نہیں، رسول کی سنت کے سوا ہمارے لیے کوئی سنت نہیں۔ کتاب موجود ہے، سنت موجود ہے، غلطی دیکھیں ٹوک دیجیے۔ صاف الفاظ میں کہہ دوں کافر ہو اگر انکار کرے، ہم پر ہر شخص اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم سے محبت قائم کرسکتا ہے۔ باقی سارے قیل وقال کو ہم نے تج دیا ہے ہم اپنا راستہ اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ اگر چلنے کے لیے راضی ہیں تو آپ کے لیے مبارک ہے کیوں کہ آپ کا فرض ہے۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں درخواست نہیں کرتے۔ یہ ہماری دلی تمنا ہے اور یہ بڑی سے بڑی چیز ہے جو ہم چاہ سکتے ہیں۔ ہم اسلام کے راستے میں خود بڑا حجاب بن گئے ہیں۔ وہ قوم اسلام کی وارث بنی ہے جو خود اسلام کو ذبح کرتی ہے دوسروں کو جھٹکا نہیں کرنے دیتی۔ حالاں کہ خود اس کا تعلق کسی قوم سے نہیں ہے۔ جو کلمے کا دوست ہے آپ کا دوست ہے، جو حق کا باغی ہے آپ کا باغی ہے۔ آپ کا تعلق اللہ کے دین ہی سے ہے۔ جس دن یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ آپ خدا کی دین کی سربلندی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے آپ دیکھیں گے کہ آپ کے لیے دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ آپ کے لیے پتھروں کے دل موم ہوجائیں گے اور بہرے کانوں میں بھی سماعت حق کی صلاحیت پیدا ہوجائے گی۔ حق کے ساتھ فطرت انسانی کو ازلی محبت ہے بشرطے کہ حق اس کے سامنے بے حجاب ہو کر آئے۔

نصرت حق کب آتی ہے؟

حضرات! اس حقیقت کو فراموش نہ کیجیے کہ سنت اللہ یہ نہیں ہے کہ ہم دین کو چاہیں یا نہ چاہیں اللہ تعالیٰ اپنے زور سے اس کو زمین میں جاری وقائم کردے گا۔ اقامت دین تو بندگی کے کاموں سے ہے، اور بندگی بندوں کا کام ہے اللہ تعالیٰ کا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ ہماری طرف سے نماز پڑھے گا نہ روزہ رکھے گا، نہ زکوٰۃ دے گا، نہ حج کرے گا اور نہ کوئی حکم بجالائے گا۔ یہ

سارے کام ہمارے کرنے کے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر ہم ان کاموں کے کرنے کا عزم بالجزم کرلیں گے اور ان کی اقامت کی راہ میں اپنی عزیز سے عزیز چیزوں کو قربان کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے تو خدا اور اس کے فرشتوں کی مدد ہمارے ساتھ ہوگی۔ پس آپ اس بات کا ہرگز انتظام نہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ خود بہ خود توحید کا پرچم سارے عالم میں لہرا دے گا۔ اس کے لیے تو بہ ہر حال ہم ہی کو سر دھڑ کی بازی لگانی پڑے گی اور اپنے سر و سینے کو زخمی کرانا ہوگا۔ ہاں جب اس راہ میں ہم وہ سب کچھ کھو دیں گے جو ہمارے پاس ہے تو ہمیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو اس راہ کے خطرات برداشت کرنے والوں کے لیے اللہ کے پاس ہے اور وہ بڑی چیز ہے۔

اقامت حق کی راہ کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے آپ سے لڑکر پہلے اپنے اوپر اللہ کی اطاعت کو لازم کیجیے اور اپنے نفس کو اللہ کا فرمانبردار بنایئے۔ اللہ کی راہ میں وہی لوگ لڑ سکتے ہیں۔ جو اس راہ میں اپنے نفس کو شکست دے چکے ہیں۔ یہ فارموں کے پر کردینے سے نہیں ہوسکتا، اس کے لیے بڑی ریاضت اور نفس کشی کی ضرورت ہوگی۔ اپنی زندگی کا احتساب کرنا اور اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرنا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ سب سے زیادہ انسان خود اپنے نفس سے شکست کھاتا ہے۔ اپنے اندر کا حریف آدمی کو بہت جلد چت کرلیتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے پہلے اس محاذ پر فتح پالینا ضروری ہے۔

جو نجاستیں آپ نے از خود اپنے اوپر لادلی ہیں ان کو فوراً دور کردیجیے اور جو چیزیں آپ کی مرضی کے خلاف مبتلا ہوگئی ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کا سامان کیجیے اگر آپ کی زندگی صحیح نہج پر آگئی اور آپ نے اپنے اوپر دین کو قائم کرلیا تو آپ کی آنکھوں کے اشاروں سے وہ کام ہوں گے جو بڑے بڑے مقالوں سے نہیں ہوسکتے۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے، عمل سے کہنا ہے عمل کی زبان سے کہنا ہے، منھ کی زبان سے بہت کم کہنا ہے۔ آپ اپنے مقصد کے عملی داعی اور ترجمان ہیں۔

اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ ہمارے لیے یہ ذرا بھی فخر کی بات نہیں ہے کہ ہم اس مقصد کے لیے اٹھے ہیں ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمارے دلوں میں اپنی بندگی کا نیک ارادہ ڈالا اور اس راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی۔ فخر و غرور سے بہت ڈرنا چاہیے اور ہر وقت اپنے رب سے چمٹے رہنا چاہیے۔ ہر عزم، خواہ حق ہو یا باطل امتحان کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ دیر

یا سویرا آپ کے ارادے کی پختگی بھی آزمائی جائے گی۔ جس کام کو آپ لے کر اٹھے ہیں اس آسمان کے نیچے سب سے مشکل کام یہی ہے اس کام میں کچے دلے اور خام آدمیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس راہ میں کامیابیوں سے پہلے صعوبتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے اور تحسین و آفرین سے زیادہ ملامت کے تیروں کے لیے سینہ سپر رہنا چاہیے۔ تحسین اس راہ میں صرف اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور مبارک ہیں وہ جو اللہ کی تحسین کے سزاوار ٹھیریں۔ اس امر واقعی سے بھی کبھی غفلت نہ ہو کہ ہمارے اور ہمارے دوسرے بھائیوں کے درمیان فرق کفر و اسلام کا نہیں ہے بلکہ پورے اور جزئی حق اور طریق کار کا فرق ہے۔ یہ فرق کچھ عرصے تک باقی رہے گا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے سبب سے کچھ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں بھی پیدا ہوتی رہیں لیکن اگر ہم پوری مضبوطی کے ساتھ اپنے مقصد پر قائم رہے اور ضمنی بحثوں میں نہ الجھے تو یہ بدگمانیاں آپ سے آپ رفع ہو جائیں گی نفس انسانی کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنا صحیح جائزہ لینے میں ہمیشہ مداہنت کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارا احتساب اور بے لاگ تبصرہ لوگوں کو کھلتا ہے۔ لیکن سچائی بہ ہر حال سچائی ہے۔ اگر صبح طلوع ہو چکی ہے تو شب کا پردہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ آنکھیں کھلیں گی اور حقائق نظر آنے لگیں گے اور جو لوگ بدگمانیوں کی بیماری میں مبتلا رہنے کے خواہش مند نہیں ہیں وہ انشاء اللہ ہمارے رفیق کار بنیں گے۔ اتنے قلیل عرصے میں بھی جو کچھ ہو چکا ہے اس میں ہمارے لیے مایوسی اور دل گرفتگی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم نے اپنے خلوص کی نہایت حقیر متاع اس راہ میں پیش کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کے صلے میں کام کی بہت سی راہیں کھول دیں۔ ہم کو جو استعداد آج حاصل ہے اگر ہم نے اس کو صحیح طور پر استعمال کیا تو انشاء اللہ اس سے بڑے کام کی راہیں کھلیں گی۔ جو ایک پیسے میں اپنے آپ کو امین ثابت کر دیتا ہے وہی مستحق ٹھیرتا ہے کہ اس کو ایک لاکھ کی امانت سونپی جائے۔